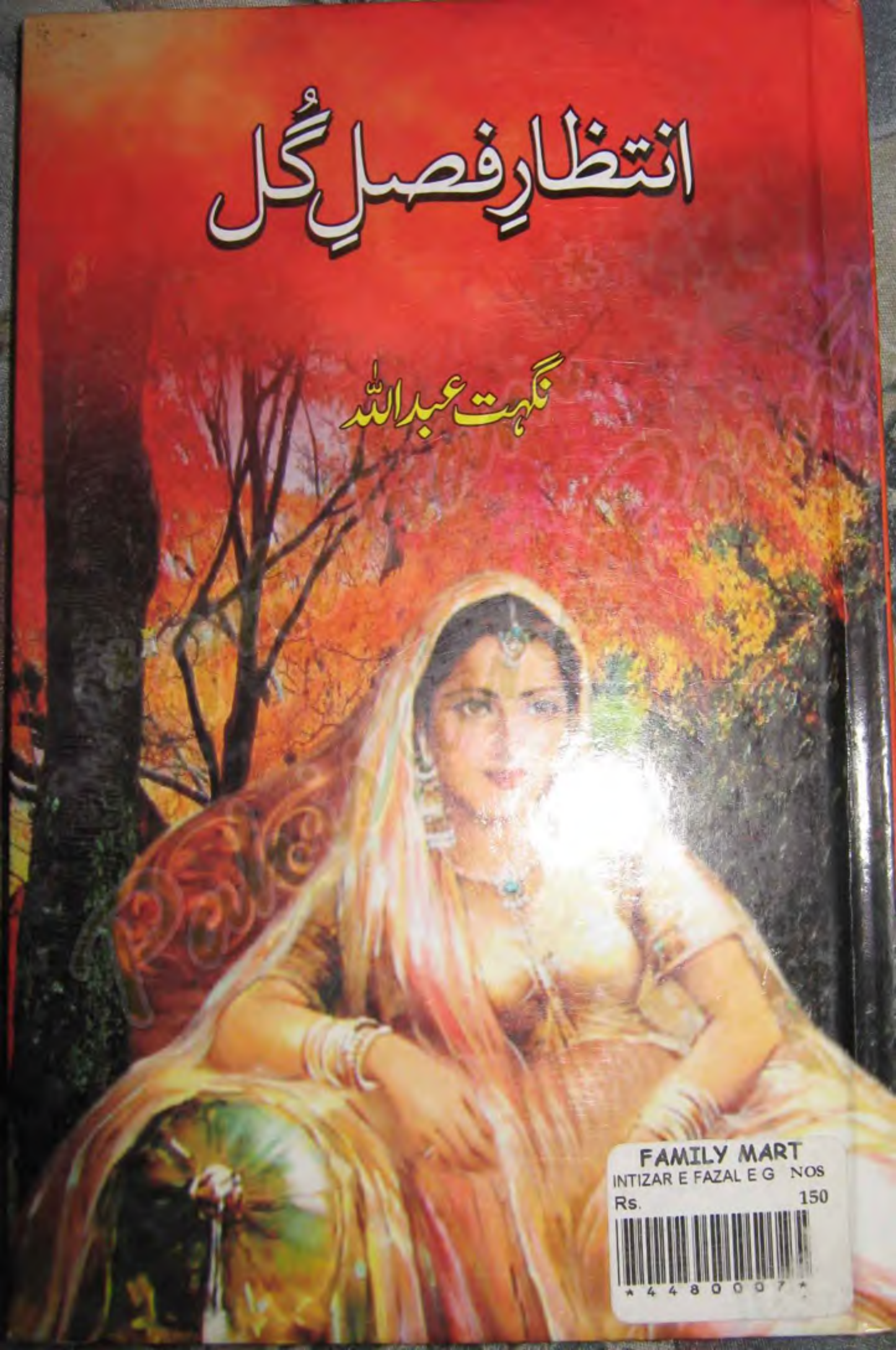


انتظارِ فصلِ گل

نگہت عبداللہ



FAMILY MART
INTIZAR E FAZAL E G NOS
Rs. 150



*
افتساب

اپنے پیارے

ماں باپ

کے نام

انتظارِ فصلِ گل

رات اندھیری اور راستہ دشوار گزار، پھر بھی خضر حیات گھوڑے کو سر پٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ اس گہری خاموش رات میں اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی لگ رہی تھی۔ گوکہ اور کسی آواز کا نہ شائبہ تھا نہ امکان، پھر بھی ذرا سی آہٹ جو یقیناً اس کا وہم ہوتی، پر وہ مزید چوکنا ہو جاتا اور پھر فوراً اپنے پیچھے اور پھر دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھتا۔

وہ بزدل نہیں تھا اگر دشمنوں میں سے دس اس کے سامنے آکھڑے ہوتے تو وہ اکیلا ہی مقابلے کے لئے ڈٹ جاتا لیکن اسے خطرہ صرف پیچھے سے وار کا تھا۔ اس لئے اس کا زیادہ دھیان اپنے پیچھے تھا اور وہ گاہے بگاہے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتا اور اطمینان کر لینے کے بعد گھوڑے کو اور تیز دوڑانے لگتا۔

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان بننے کا پر مسرت اعلان مسلمانوں کے اندر ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کر گیا اور ایک آزاد مملکت میں سانس لینے کی آرزو میں اکثریت اپنا مال و اسباب چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگی۔ خضر حیات کا خاندان بھی آج رات سفر کر رہا تھا۔ سفر کے ابتدائی مرحلے میں تو خضر حیات ان کے ساتھ رہا۔ لیکن پھر اسے جانے کیا خیال آیا کہ اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اور یہ خیال تھا راہِ جیش کمار سے ملنے کا اور اس پر وقاری لڑکی کو آخری بار دیکھنے کا جو راہِ جیش کی بہن تھی۔

پوچھا اپنے نام کی خصوصیت لئے ہوئے کہ مقابل اسے دیکھتے ہی بے اختیار ہاتھ باندھ کر سر جھکا جائے اور یہ حرکت بالکل غیر ارادی طور پر بار بار خضر سے بھی سرزد ہو چکی تھی۔ گوکہ دونوں ندی کے ایسے کنارے تھے جو ساتھ ساتھ چل تو سکتے ہیں لیکن جن کا ملن ناممکنات میں سے ہے اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔

راہِ جیش سے اس کی دوستی اسکول کے زمانے میں ہوئی تھی اور گزرتے وقت نے ان دونوں کو ایک مضبوط ڈوری میں باندھ دیا تھا۔ ایسی مضبوط ڈوری جسے بدلتے حالات بھی توڑنے میں ناکام

رہے تھے۔ راجیش ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا اور اکثر اس کے پاس آ بھی جاتا تھا اور یہ بھی جب موقع ملتا اس کی طرف نکل جاتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی آمد و رفت صرف مہمان خانے تک محدود رہی پھر جب دوستی کی بنیادیں مضبوط ہو کر دونوں کو یک جان دو قالب میں ڈھال گئیں تب راجیش کے مانتا جی اور پتا جی بھی اس پر بھرپور اعتماد کرنے لگے۔ اور وہ ان کے گھر کے فرد کی سی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ اور جب ان کے گھر بلا جھجک آتا جانا شروع ہوا۔ تب اس نے پوجا کو دیکھا تھا۔ سرودھ۔ مقابل کو تسخیر کر لینے والی آنکھیں، ستواں ناک، قدرے بھرے بھرے ہونٹ، سلوٹی شاموں کا روپ چرائے جب وہ پہلی بار اس کے سامنے آئی تو وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے یاد آیا وہ پہلی ملاقات کا منظر۔

”سلام.....!“ اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے سر کو ذرا سا خم دے کر کہا تھا۔

”نمستے.....!“ پوچھنے لگا۔ اس کی آواز میں جھانچروں کی کھٹک تھی، اس کے باوجود اس ایک لفظ ”نمستے“ نے اسے احساس دلایا کہ اس سے جتنے فاصلے پر وہ اب کھڑا ہے، صدیوں کی مسافت کے بعد بھی یہیں کھڑا ہے گا۔ اس درمیانی فاصلے کو مٹا نہیں سکے گا۔

”آپ بیٹھے خضر بابو.....! راجیش بھیا بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔“ وہ آہستہ آواز میں بولی اور وہ بہت کچھ کھودینے کے احساس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نظریں اس سرودھ لڑکی کے قدموں میں اُلجھنے لگی تھیں۔

”چائے لاؤں آپ کے لئے.....؟“

”نہیں.....“

”کیوں.....؟“

”راجیش آجائے، اس کے ساتھ ہی پی لوں گا۔“ اس نے کرسی کی پشت سے سرٹکیتے ہوئے براہ راست اس کی طرف دیکھا اور وہ جو بڑے اعتماد سے کھڑی تھی، پہلے پلکیں جھپکیں، پھر وہاں سے جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ وہ خاصا محظوظ ہوا۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں، بیٹھ جائیے ناں.....“ وہ اسے روکنے کی غرض سے بولا۔

”میں دیکھتی ہوں راجیش بھیا آئے کہ نہیں۔“ وہ پلٹی تو جیسے گھٹا چھا گئی۔ کمر سے نیچے جاتے سیاہ بال جن میں وہ الجھتا چلا گیا تھا۔

”ہمارے درمیان مذہب کی خلیج حائل ہے جسے پاشنا نہ میرے اختیار میں ہے نہ اس کے۔“ اگلے کئی دن تک وہ اپنے آپ کو یہ بات سمجھاتا رہا تھا اور پھر وہ خود کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔

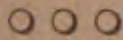
”ہم ندی کے دو کنارے ہیں۔“ یہ ایک نہ مٹنے والا احساس تھا جو آئندہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا جس نے اسے کبھی حد سے بڑھنے نہیں دیا۔ اور شاید وہ بھی حقیقتوں سے نظریں چرانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ جیسی اس کے ضبط کو آزمانے یونہی بلا وجہ کبھی اس کے سامنے نہیں آئی کبھی کبھار ہی اچانک سامنا ہو جاتا تو جہاں یہ اپنی جگہ ٹھٹھک جاتا وہاں وہ بھی جھجکتی اور فوراً پلٹ جاتی تھی۔ وہ خود یہی چاہتا تھا۔

راجیش کے گھر جاتے ہوئے راستے بھر دعائیں کرتا تھا کہ اس کا سامنا نہ ہو، ایمان ڈولنے لگتا ہے۔ اور یہ ایسی دعا تھی جو ہر دو صورتوں میں اسے آزدہ ہی کر جاتی تھی۔ دعا قبول ہوتی تو وہ اس کی دید کی حسرت لئے واپس آتا اور مقبول ہونے کی صورت میں اس کے دل کا بوجھ بڑھ جاتا کہ اسے دیکھ سکتا ہے۔ چھو نہیں سکتا۔

اب جبکہ وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا تھا تو راجیش سے مل کر جانا چاہتا تھا۔ گو کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے اس کے پاس جانے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن حالات اجازت نہیں دے رہے تھے۔ اب بھی وہ بڑی مشکل سے اماں اور ابا کو منا پایا تھا۔ اماں، ابا اور بڑے بھیا کوئی بھی اسے جانے نہیں دے رہے تھے، لیکن دوستی کا تقاضا تھا اور اندر کہیں اس سرودھ لڑکی کو آخری بار دیکھنے کی شدید خواہش جسے وہ کسی طور دبا نہیں پایا تو اماں کے پیر پکڑ لئے۔

”مجھے جانے دیجئے۔ میں سرحد پر آپ سے آن ملوں گا۔“ اس کے لہجے میں منت تھی اور دل کو گرفت میں لینے والی التجا۔ اماں نہ چاہتے ہوئے بھی مان گئیں۔ اور اسے اللہ کی امان میں دے کر خود اپنے سفر پر روانہ ہوئیں۔

آج وہ ہمیشہ والی دعا نہیں مانگ رہا تھا۔ بلکہ صرف ایک نظر اسے دیکھنے کی دعا تھی، جو دل سے نکل کر ہونٹوں سے چپک گئی تھی۔



گلی کو چوں میں ایک شور سا تھا۔ اتنے دنوں سے آس و پاس میں گھرے چہرے اب اچانک کھل اٹھے تھے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر کامیابی مقدم ہوئی تو سب ایک دوسرے کو بڑھ بڑھ کر مبارکباد دے رہے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان سب کی زبان پر پاکستان کا نام تھا۔ ایسے میں حق نوازا اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا ہر آنے جانے والے کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں اس کا ذہن بیدار تھا یا نہیں۔ بس آنکھیں ہی کھلی تھیں جن میں سرخ سرخ ڈورے

تیرے نظر آرہے تھے۔ نو جوانوں کی ایک ٹولی ادھر سے گزری تو کسی نے پکار کر کہا۔
"یار حق نواز.....! پتا ہے، پاکستان بن گیا ہے۔"

"اچھا.....!" اس نے یوں کہا جیسے اسے کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"یار.....! کم از کم آج تو اپنی حالت ٹھیک رکھو۔" ایک لڑکے نے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑا اور تھیسٹ کر کھڑکی سے باہر کھینچ لیا۔

"کیا.....! یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ.....؟" اس کی لڑکھڑاتی آواز میں خوف سمٹ آیا تھا۔

"آؤ تمہیں شہر کی سیر کرا دیں۔ ذرا دیکھو، لوگ کس قدر جشن منا رہے ہیں" عرفان نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو اس کا توازن بگڑ گیا۔

"ارے ارے.....!" ایک لڑکے نے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا اور عرفان سے کہنے لگا۔

"ذرا ہاتھ قابو میں رکھ کر بات کرو، بیچارے میں جان ہی کتنی ہے۔"

"معاف کرنا یار.....! مجھے خیال نہیں رہا۔" عرفان نے معذرت کی پھر کہنے لگا "کتنے افسوس کی بات ہے، جوان جہان ہو لیکن ایسی بُری لت میں پڑ کر جوانی برباد کیے دے رہے ہو۔

بیٹا.....! ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ کب تک بوڑھی ماں کے سینے کا ناسور بنے رہو گے۔"

"عرفان ٹھیک کہہ رہا ہے حق نواز.....!" عابد نے بھی اسے سمجھانا فرض سمجھا۔

"اب تمہاری ماں کے آرام کا وقت ہے، تمہیں چاہیے کہ اس کا سہارا بنو، ناکہ تم اللہ اس پر

بوجھ بنے ہوئے ہو۔"

وہ خالی خالی نظروں سے ایک ایک کی صورت نکلتے گیا۔ پتا نہیں کوئی بات اس کی سمجھ میں آ بھی رہی تھی کہ نہیں پس سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو۔" اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔

"چھوڑنا مت..... گر جائے گا۔" عرفان نے خود بڑھ کر اسے سنبھالا پھر ساتھیوں سے کہنے لگا۔

"چلو اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ آئیں۔"

"چلو.....!" سب اسے لئے ہوئے اس کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ حق نواز کی بس ایک بوڑھی ماں ہی تھی۔ اس لئے اکثر لڑکے بالے بلا جھک اس کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔

"اماں.....!" عرفان نے دروازے میں رک کر آواز دی۔ پھر سب ایک ساتھ اندر چلے گئے۔ بیچاری بوڑھی عورت مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ آواز پر سر اٹھا کر دیکھا پھر اپنے بیٹے پر نظر پڑی جو دوسروں کے سہارے کھڑا تھا۔

"کیا ہوا نواز کو.....؟" وہ دال کر پوچھنے لگیں۔ گو کہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر ہی

دوسروں کے سہارے چل کر آتا تھا۔ بلکہ اماں کو تو حسرت ہی تھی کہ کبھی وہ خود سے چل کر اس کے پاس آئے۔

"یہ نفسے میں ہے۔" عرفان نے کہا اور اسے قریب کچھی چار پائی پر لٹا دیا۔

"پتا نہیں، یہ کب سدھرے گا۔" اماں کے لہجے میں مایوسی اور تاسف تھا۔

"اماں.....! اگر اجازت دو تو ہم اسے سدھا دیں۔" عابد کو ان کی مایوسی پر ترس آیا تو کہنے لگا۔

"کیسے سدھا رو گے.....؟"

"رسیوں سے باندھ کر بٹھا دیں گے اسے پھر دیکھتے ہیں یہ کیسے بری سنگت میں جاتا ہے۔"

"ہاں اماں.....! بس ذرا دل پر پتھر رکھ لو۔" عرفان نے عابد کی بات کی تائید کی۔

"بیٹا.....! یہ بہت کمزور ہے۔" اماں کا اپنا دل کمزور تھا۔

"ساری کمزوری دور ہو جائے گی۔ بس تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔" سب اصرار کرنے لگے کہ اسی وقت اسے لے جائیں گے، لیکن اماں رضامند نہیں ہوئیں کہنے لگیں۔

"آج..... رہنے دو، میں اسے سمجھا دیکھوں گی، اگر نہیں سمجھا تو پھر بے شک لے جاتا۔"

"ٹھیک ہے..... ہم کل آ کر دیکھیں گے۔" وہ سب ایک دوسرے کو چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔

"اچھا اماں.....! ہم چلتے ہیں اگر کوئی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔" عرفان نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

"اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔" اماں دعائیں دینے لگیں۔ جنہیں اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے وہ سب چلے گئے۔

"ایک یہ ہیں اور ایک تو ہے۔" اماں چار پائی پر بے سدھ پڑے حق نواز کو دیکھنے لگیں۔ ان کا دل ڈکھ سے بھر گیا۔ ایک ہی اولاد اور وہ بھی ناسور بن کر رہ گیا تھا۔ کتنا آسرا تھا کہ جوان ہو گا تو

بیوگی کے سارے دکھ سمیٹ لے گا لیکن۔ دل کا درد آنکھوں میں سمٹ آیا اور بوڑھی آنکھیں جھرجھر بنے لگیں۔ وہ اتنی بوڑھی نہیں تھیں۔ لیکن حالات نے انہیں وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کی دہلیز پار کرادی تھی اور کچھ انہوں نے خود ہی مصیبت جوانی کا دامن جلد چھوڑ دیا تھا۔ سر پر کوئی سائبان نہ ہو تو

جوانی خود اپنے لئے خطرہ بن جاتی ہے اسی لئے جس روز ان کے سیاہ بالوں والے سر کو بیوگی کی سفید چادر نے ڈھانپا اسی روز انہوں نے اپنے البیلے دور کو فون کر دیا تھا۔ دن رات مشین پر جھک کر کمر

دوہری کیا ہوئی کہ سب کی اماں بن گئیں، جگت اماں۔

سب پہلے پہل انہیں حق نواز کی اماں کہتے پھر جانے کیسے حق نواز پس منظر میں چلا گیا اور وہ صرف اماں رہ گئیں۔ وہ خود بھی چاہتی تھیں۔ کیونکہ جانتی تھیں کہ بقیہ زندگی عزت سے گزارنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ حق نواز آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ جب سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ وہ خاصا ذہین، اور نیک لڑکا تھا۔ لیکن جب راہنمائی کرنے والا ہاتھ سر پر نہ رہا تو وہ زیادہ دن تک اپنے راستے پر نہ چل سکا۔ بہت جلد تو وہ بری صحبت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اپنے آپ کو سمجھانے اور سنبھالنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن جب ہر راستہ ہی بے نشان ہوتا گیا۔ تب اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اور حالات کیا تھے۔

گھر میں اماں جو مشین سے نانا جوڑ کر خود بھی مشین ہو گئی تھیں۔ پورا دن اور رات کا بیشتر حصہ بھی وہ مشین پر جھکے ہوئے گزارتیں۔ اس کے باوجود وہ وقت کی روٹی بمشکل نصیب ہوتی تھی۔ اسکول سے دلچسپی اس وقت تک رہی، جب تک ضروریات پوری ہوتی رہیں اور جب معمولی سے معمولی چیز کا حصول بھی ناممکن نظر آنے لگا۔ تب دلچسپی آپ ہی آپ ختم ہو گئی۔ پہلے وہ سزا کے ڈر سے اسکول سے غائب ہونے لگا۔ اور پھر بالکل ہی چھوڑ دیا۔

یہیں سے اس کی بد قسمتی کی ابتدا ہوئی۔ اسکول کے بہانے گھر سے نکلتا اور سارا دن جانے کہاں کہاں کی خاک چاٹتا رہتا تھا۔ اماں اس کی طرف سے مطمئن تھیں۔ اور اس آس میں کہ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا تو ان کے تمام دلدلر سمیٹ لے گا۔ انہیں اپنی محنت کا حوصلہ مل جائے گا۔ لیکن محنت کا صلہ تو کیا ملتا وہ تو اللہ ان کے ناتواں کاندھوں کو جھکا گیا تھا۔ وہ کیا کرتا، جب کسی بھی ضرورت کے لئے اماں سے کہتا اور پھر جس طرح ان کی چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال سا بن جاتا۔ وہ اسے آزرہ بھی کرتا اور آئندہ کسی ضرورت کے لئے کہنے سے روک بھی دیتا تھا۔ یونہی اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹتے گھونٹتے وہ اس مقام پر آ گیا تھا۔

شاید کبھی کسی دن وہ کہیں بیٹھا اپنے حالات پر کڑھ رہا تھا۔ شگفتگی کا احساس اس کے پورے وجود پر چھایا تھا۔ جب کسی نے اس کے پاس آ کر کہا تھا۔

”لو یار! مارو دم..... منے غم“

اور پھر وہ غموں سے لڑنے کی طاقت کھو بیٹھا۔ شاید یہ راستہ زیادہ آسان تھا۔ کوئی تردید نہیں، کوئی جدوجہد نہیں بس ایک ذرا سادھواں حلق سے نیچے اترا اور سارے غموں سے نجات مل گئی۔ کبھی جو ہوش میں ہوتا تو سوچتا کہ اماں کے چہرے کی جن لکیروں کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گہری ہجر اماں کو کس مقام پر کھڑا کر گئی ہیں کہ ان کا شمار زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ اسے تو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ اماں کا خیال کیا کرتا۔

”حق نواز.....!“ اماں نے قریب آ کر اسے پکارا پھلے آدھے گھٹنے سے وہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا بس صرف آنکھیں کھولے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ ان کے پکارنے پر بھی یونہی پڑا رہا۔

”بیٹا.....! کھانا نہیں کھاؤ گے.....؟“ وہ ماں تھیں، ماما سے مجبور ہو کر اس کی پیشانی پر محبت سے ہاتھ رکھ گئیں۔ اور پھر اولاد خواہ کسی بھی ہو، ماں کا دل اس سے کبھی متنفر نہیں ہوتا۔

”بھوک نہیں ہے اماں.....!“ اس نے بے دلی سے جواب دے کر کروٹ بدل لی۔

”میں لے کر آتی ہوں۔ کھانا سامنے آئے گا تو بھوک بھی لگ جائے گی۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جا کر ایک پلیٹ میں سالن اور ایک میں روٹی رکھ کر لے آئیں۔

”اٹھ کر بیٹھو..... میں تمہیں کھلا دیتی ہوں۔“

”میں بچہ تو نہیں ہوں۔ وہ ہنسا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بڑے ہو گئے ہو کیا.....؟“ اس کے ایک ذرا سے ہنس دینے سے اماں کے چہرے پر رونق آ گئی۔

”ہاں.....!“

”پھر تمہیں میرا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ کیوں دکھاری ماں کو اور دکھ دینے پر تلے ہوئے ہو۔“ اماں نے اسے سمجھانے کا ارادہ کیا۔

”میں نے کیا کیا ہے اماں میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”یہی تو دکھ ہے کہ تم کچھ نہیں کہتے، ہر بات اپنے تک رکھ کر اس حال کو پہنچ گئے ہو۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ ”بیٹا! تم یہ بری لت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔“

”چھوڑ دوں گا۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔

”کب.....؟“ اماں جانتی تھیں کہ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا ہے پھر بھی پوچھنے لگیں۔

”بس چھوڑ دوں گا۔“

”وعدہ کرو..... اب کبھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“

”ہاں..... ہاں..... وعدہ کر رہا ہوں اور تو یہ بھی۔“ دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ لیے۔

وہ پہلی بار وعدہ نہیں کر رہا تھا۔ ہمیشہ وعدہ کرتا اور بھول جاتا تھا اس کے باوجود اماں پر امید ہو گئیں۔ اس کی بات کا اعتبار کر لیا۔ یہاں تک سوچا کہ اب اسے عرفان اور عابد کے حوالے نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اگلے دن وہ سارا دن غائب رہا۔ شام میں جب لوٹا تو اس کی وقتی حالت تھی۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور پڑتے کہیں تھے۔ اس کے ڈولتے قدموں کے ساتھ اماں کا دل بھی ڈولتا

گیا۔ اور پھر وہ اسی وقت جا کر عرفان کو بلالائیں۔
 ”لے جاؤ اسے اور جو سلوک چاہے اس کے ساتھ کرو لیکن خدا را اسے ٹھیک کر دو۔“ اس کی
 بہتری کی خاطر بالآخر دل پر پتھر رکھ ہی لیا تھا۔

○ ○ ○

راجیش کا مکان دور سے نظر آنے لگا تھا۔ خضر گھوڑے سے اتر اور اس کی باگیں تھام کر محتاط
 انداز سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جس وقت اس نے راجیش کے دروازے پر دستک
 دی، رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔
 ”کون.....؟“ دوسری اور پھر تیسری دستک کے بعد، راجیش کے ملازم رام کا کا کی آواز آئی
 تھی۔

”میں ہوں کا کا، خضر.....“ اس نے سرگوشی میں بتایا۔
 ”ارے.....!“ دروازہ فوراً کھل گیا۔ ”اس وقت کیسے آئے باو سب خیر تو ہے ناں۔“
 ”ہاں کا کا.....! سب خیر ہے میں راجیش سے ملنے آیا ہوں۔“
 ”کون ہے کا کا.....!“ پوچھا کی آواز پر وہ فوراً رام کا کا کے پیچھے دیکھنے لگا۔ اور پہلی بار وہ اپنی
 دُعا کے قبول ہونے پر آزرہ نہیں ہوا۔
 ”خضر یا آپ اس سے کیسے آئے۔“ وہ اسے دیکھتے ہی قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔
 ”راجیش سے ملنے آیا تھا۔“
 ”اندر آجائیے۔“

”میں جلدی میں ہوں پوچھا جی، اگر راجیش.....“
 ”آپ اندر تو آئیں۔“ اس کی بات کاٹ کر اور اپنی بات کہہ کر وہ پلٹ گئی اور وہ ناچار اس
 کے پیچھے چل پڑا۔

”راجیش ہے کہاں.....؟“ اندر آتے ہی وہ پوچھنے لگا۔
 ”بھیا دور و ز پہلے ہی بھیج گئے ہیں۔“
 ”یہ تو بہت برا ہوا۔ اس کا مطلب ہے۔ میں اس سے نہیں مل سکوں گا۔“ وہ آہستہ آواز میں
 جیسے اپنے آپ سے بولا۔ اس کے باوجود اس نے سن لیا۔ اور پوچھنے لگی۔
 ”کیا مطلب.....؟“

”اصل میں، میں پاکستان جا رہا ہوں اس لئے۔“

”سب.....؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر بے تابی سے پوچھنے لگی۔
 ”ابھی.....“
 ”ابھی.....؟“

”ہاں.....! گھر والے تو چلے گئے ہیں۔ میں راستے ہی میں ادھر نکل آیا۔ سوچا تھا۔ آخری
 بار راجیش سے مل لوں گا۔“

انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو ”اور تم سے بھی۔“ وہ پلکوں کی جھلکیں اٹھائے اسے دیکھتی رہی
 پھر کہنے لگی۔

”اگر راجیش بھیا کو پتا ہوتا تو کبھی نہ جاتے۔“ قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”آپ بیٹھیں
 ناں، میں کا کا سے کہتی ہوں چائے بنا لائیں۔“

”نہیں پوچھا جی.....! چائے رہنے دیں، میں اسی وقت نکل جاؤں تو اچھا ہے، گھر والوں
 سے جا ملوں گا۔“

”کچھ دیر رک جاؤ.....“

”بس کچھ دیر اور.....“

اس کا ہر انداز پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ لیکن لب خاموش تھے۔

یہ آنکھیں، یہ میری آنکھیں۔

پھر کہاں ڈھونڈ پائیں گی تمہیں۔

”میں چلوں.....“ وہ اسے گم صم کھڑے دیکھ کر کہنے لگا تو وہ چونک گئی۔ پھر کہنے لگی۔

”ایک بات کہوں خضر یا بو.....!“

”جی.....!“ اس نے فقط اتنا کہا اور سوالیہ نظریں اس پر نکا دیں۔

”آپ کو اکیلے سفر نہیں کرنا چاہیے۔ حالات بہت خراب ہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے لیکن راجیش سے ملنے کی خواہش کو میں دبا نہ سکا۔“ کاش وہ کہہ سکے تمہیں

دیکھنے کی خواہش بھی شدید تھی۔

”مجھے افسوس ہے اور یقیناً راجیش بھیا کو بھی آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہوگا۔“ وہ کہنے

لگی۔

”اچھا میں چلوں۔“ اس نے طویل سانس لے کر اس کے سراپے کو بغور دیکھا۔ ایمان کے

ساتھ ہستی کو بھی ڈانواں ڈول کر رہی تھی۔ وہ فوراً نظریں جھکا گیا۔

”ماتا جی اور پتا جی کو میرا سلام کہیے گا۔ اس وقت انہیں اٹھانا مناسب نہیں لگتا ورنہ میں ان

سے مل لیتا۔“
وہ سر ہلاتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔ اور ابھی دونوں بیرونی دروازے کے قریب ہی پہنچے ہی تھے کہ باہر سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جو بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھیں۔
”خضر بابو.....!“ اس نے بے خیالی میں اس کا بازو تھام لیا۔ ”ابھی مت جائیے۔“
وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی مسخر کر لینے والی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ اور کبھی نہ سمسنے والا فاصلہ جانے کیسے سمٹ گیا کہ اس کا لرزتا بدن اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

”مجھے ابھی جانا ہے..... اماں میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔“ اسے اپنی آواز اجنبی لگی۔
”لیکن باہر بہت خطرہ ہے۔ آپ آوازیں نہیں سن رہے۔“
”ہاں.....!“ وہ جانے کیا سوچنے لگا کہ اس کی خوفزدہ سی سرگوشی سنائی دی۔
”خضر بابو.....! اندر چلیں۔“

اس نے بہت آہستگی سے اپنا بازو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیا اور باہر کی طرف قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ باہر کی آوازیں بہت قریب سے آنے لگیں۔
”بلونت سنگھ آج حیات محمد کے گھر والے بھی نکلے ہوں گے۔ ان کے پیچھے کسی کو بھیجا۔“
”ان کی فکر چھوڑو“ ایک اور آواز آئی۔ ”خضر کو ڈھونڈو۔ اسے میں نے اسی طرف آتے دیکھا تھا۔“

”اوائے زندہ نہ جانے پائے۔“ کرخت آواز سنائی دی۔
”خضر بابو.....! وہ بہت سارے ہیں اور آپ اکیلے۔“ وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔
”میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں یہاں کس کے پاس آتا ہوں اور میری وجہ سے آپ سب۔“ اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ باہر کوئی کہہ رہا تھا۔
”راجیش کے گھر میں دیکھو..... وہیں چھپا ہوگا۔“

”خضر بابو بھگوان کے لئے۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی پچھلے آگن میں لے گئی۔ اور وہاں سے اسے دیوار پر چڑھ کر باہر کودنے کا اشارہ کیا۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ فوراً دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا اور ابھی وہ سنبھل کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ دھم کی آواز پر فوراً پلٹ کر دیکھا وہ زمین سے اٹھ رہی تھی۔

”آپ.....!“ وہ حیران ہوا۔

”یہ راست آپ کے لئے انتخابان ہے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”اور راستہ ڈھونڈنے کا وقت نہیں ہے،“

چلیے، میں آپ کو اس حد تک چھوڑ آؤں، جہاں سے قافلے روانہ ہو رہے ہیں۔“
”اس طرح تو آپ.....“

”میری فکر مت کریں۔“ وہ تیزی سے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو بھاگنے لگی۔
کچکی گلیاں، کبھی تنگ اور کبھی چوڑی، اس کے بعد طویل سنان سڑک اور پھر کھیتوں کا سلسلہ وہ بھاگتے رہے بھاگتے رہے، یہاں تک کہ صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی۔
”پوچھا.....!“ وہ ایک دم رک گیا۔ ”اب تم لوٹ جاؤ۔“
”نہیں خضر بابو.....! مجھے جب تک آپ کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا میں نہیں جاؤں گی۔“

”میری وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں مت ڈالو۔“ وہ جھنجھلایا۔
”بس تھوڑی دور اور ان کھیتوں کی حد سے آگے۔“

وہ چل پڑی..... اور مجبوراً اسے بھی قدم بڑھانے پڑے، پھر جیسے ہی کھیتوں کی حد ختم ہوئی،
دورے انسانی ہیولے، حرکت کرتے نظر آنے لگے۔
”میرا خیال ہے کوئی قافلہ ہے۔“ وہ رک کر کہنے لگا۔ ”اب تم جاؤ، وہاں تک میں خود چلا جاؤں گا۔“

”جب یہاں تک آگئی ہوں تو تھوڑا آگے جانے میں کیا حرج ہے۔“
”تم چاہتی کیا ہو.....؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”اپنا اطمینان.....“ پھر نظریں چراتے ہوئی بولی۔ ”میں، دیکھنا چاہتی ہوں کہ عزیز ترین ہستی کو الوداع کہنے پر دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔“
”پوچھا.....!“ وہ حیران ہوا۔

”ہاں خضر بابو.....! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔“ وہ کتنی دیر تک کھڑا اس کی طرف دیکھے گیا۔ اب اس مقام پر اسے کیا کہنا کہ میرے جذبات بھی تم سے مختلف نہیں ہیں۔ اب خاموشی ہی میں بہتری تھی۔ اس لئے کہ چپ چاپ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قافلے کی طرف چل پڑا۔
وہ قافلہ کیا تھا، بس کتنی کے چند لوگ جو جانے کیسے بلوائیوں کی درندگی کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے۔ اور باقی سب..... اس کی نظریں کھلے میدان میں یہاں سے وہاں تک بھٹکتی چلی گئیں۔
ایک خون کا دریا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور دوسرا اس کی آنکھوں میں اتر رہا تھا۔
”خضر بابو.....! ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔“ ایک بوڑھی فریاد۔

”خضر چاچا میری ماں کو.....“ معصوم سسکیاں۔

وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھنے لگا۔

کتنی کے چند لوگ اور اتنی ڈھیر ساری فریادیں۔ وہ یوں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے، جیسے ان کے درمیان کوئی مسیحا آگیا ہو اور جو ابھی ہاتھ سے اشارہ کرے گا اور ایک بل میں زمین پر بکھری لاشیں ہستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوں گی۔

”میرے خدا.....!“ اس کی نظریں دور آسمانوں پر بھٹکنے لگیں۔ وہ ان سب کو کیسے حوصلہ دے۔ کہاں سے لائے وہ الفاظ جو زخموں پر مرہم کا کام دیں۔

”بیٹا اچھا ہوا۔ تم راستہ بدل گئے تھے ورنہ.....“

”یہ کون کیا کہہ رہا ہے۔“ وہ چونکا اور اس کے سارے احساسات ایک ساتھ بیدار ہو گئے۔

اگلے لمحے وہ ایک ایک چہرہ ہاتھوں میں لے کر دیکھ رہا تھا۔

”اماں.....! ابا.....! بڑے بھیا.....!“ وہ پاگلوں کی طرح چیخا اور اماں کے خون آلودہ سینے پر پیشانی ٹیک کر رونے لگا۔ اماں اسے اللہ کی اماں میں دے کر خود اس راہ پر چل پڑی تھیں کہ اس کی کوئی پکار کوئی فریاد انہیں واپسی پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

”میرے خدا.....! کوئی تو مہربان ہاتھ ہو جو مجھے اس درد کے صحرا سے کھینچ لے۔

کوئی مہربان کا ندھا جس پر سر رکھوں تو درد کی شدت سے پھٹا دل ٹھہر جائے۔

کوئی تو آئے.....

”کوئی تو آئے.....“

اس کے آنسو صدا دینے لگے اور اسی وقت ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آٹھرا۔

”خضر بابو.....! بس کریں۔“ پھر وہ گھٹنے زمین پر ٹیکتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ اس نے سر اٹھا

کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم ابھی گئیں نہیں۔“

”میں اب نہیں جاؤں گی۔“

”کیا.....؟“ اس کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی اور پوچھا اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

”مجھے اپنے ساتھ لے چلو خضر بابو، میں یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ ان دردوں کے درمیان

جو آزادی کا خواب دیکھنے والوں کے خون سے ہوئی کھیلے ہیں۔“

”پوچھا تم.....!“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”تم اگر نہیں لے کر جاؤ گے تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے جان دے دوں گی لیکن واپس نہیں جاؤں

گی۔“

”ہو توئی کی باتیں مت کرو۔“ وہ پھر بھنجھٹایا اور چیخا۔

”تم کچھ بھی کہو لیکن میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی جس میں ہر بل یہ احساس کچھوکتا رہے کہ میں ایک خون کا دریا عبور کر کے یہاں تک آئی ہوں۔ اس کے برعکس اس خون کے دریا میں بہہ جانے میں میری شانتی ہے۔ تم جاؤ خضر بابو، میں یہیں بیٹھ رہوں گی زندگی کی آخری سانس تک۔“

وہ اماں کے بے جان چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کیا کروں۔ کچھ دیر بعد جب اس کی طرف پلٹا تو بہت خاموشی سے اس کا آٹھل سر پر اوڑھا کر اس کے چہرے کے آگے تک کھینچ لیا۔

”کسی کے بھی پوچھنے پر اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنا۔“

ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجہ تھا وہ اسی پر مطمئن ہو گئی۔

وہ فاصلے جنہیں سمیٹنا اس کے خیال میں ناممکنات میں سے تھا۔ وہ یوں سمٹ کر اسے سچ راہ میں کھڑا کر گئے تھے جہاں وہ کچھ نہیں پارہا تھا کہ فاصلے سمٹ جانے پر خوش ہو یا انہیں سمیٹ دینے والی ہستیوں کا ماتم کرے۔



عرفان کچھ دیر کھڑا حق نوازی کی طرف تاسف سے دیکھتا رہا۔ اسے اماں پر ترس بھی آ رہا تھا جو بظاہر تو دل پر پتھر رکھے کھڑی تھیں۔ لیکن ان کے ہر انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

”اماں.....! تم فکر مت کرو، ہم اس کے ساتھ کچھ برا نہیں کریں گے۔“

عرفان نے اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ان کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔

”برائی تو یہ خود اپنے ساتھ کر رہا ہے۔“ اماں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”ہاں.....! لیکن اب یہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”ہم اسے

یہیں رکھ کر بھی اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ لیکن تم ماں ہو ناں تم سے اس کا رونا گڑا گزانا۔ برداشت

نہیں ہوگا۔ اس لئے ہم اسے ولی کے گھر رکھیں گے۔ اس کا اکیلا گھر ہے۔ کوئی پریشانی کی بات

نہیں ہوگی۔“ پھر وہ کافی دیر تک اماں کو تسلیاں دیتا رہا۔

”کب تک ٹھیک ہو جائے گا.....؟“ اماں بڑی آس سے پوچھنے لگیں۔

”زیادہ دن نہیں گئیں گے، بس تم دعا کرتی رہنا۔“

”بیٹا.....! میں تو ہر دم دعا کرتی ہوں۔“

”ایک کام اور بھی کرو۔“ عرفان نے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔
 ”اس کی شادی کی تیاری کر رکھو۔“
 ”کیا.....؟“

”ہاں اماں.....! یہ ٹھیک ہو جائے تو فوراً اس کی شادی کر دیتا۔ سر پر ذمہ داری پڑے گی تو اسے بھانے کے چکر میں آئندہ بری صحبت میں نہیں جائے گا۔“
 ”ٹھیک کہہ رہے ہو تم.....! لیکن بیٹا کون اسے لڑکی دے گا کیونکہ سب ہی جانتے ہیں کہ یہ۔“ اماں خاموش ہو کر حق نواز کی طرف دیکھنے لگیں جو چارپائی پر اوندھالیا تھا۔
 ”لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ آج کل ہندوستان سے بہت قافلے آرہے ہیں۔ جن میں بہت سی بے سہارا لڑکیاں ہیں۔ نواز ٹھیک ہو جائے تو پھر کمپ جا کر کسی لڑکی کے لئے بات کر لینا۔ تمہارے بیٹے کا گھر بھی بس جائے گا اور کسی بے سہارا کا بھی بھلا ہو جائے گا۔“
 عرفان کا پر خلوص مشورہ اماں کو بہت پسند آیا۔ اور وہ پل میں یوں نظر آنے لگیں جیسے ان کا بس چلے تو وہ ابھی جا کر کسی لڑکی کو لے آئیں اور جھٹ پٹ اس کا نواز کے ساتھ نکاح پڑھوا دیں۔
 ”تو پھر میں اسے لے جاؤں.....؟“ عرفان اجازت طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں ہاں.....! لے جاؤ.....“ اماں نے بخوشی اجازت دے دی تو وہ حق نواز کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور سہارا دے کر چلاتا ہوا ہارنگل گیا۔ اماں دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے چلی تھیں، پھر وہ تو وہیں رک گئیں۔ لیکن ان کی دعائیں حق نواز کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھیں۔

اللہ میاں جب آزمائش میں ڈالتا ہے تو بندے کو اسے برداشت کرنے اور اس سے نکلنے کی طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ کبھی انسان کی قوت برداشت سے زیادہ اسے نہیں آزماتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی میں قوت برداشت کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ اور پھر شاید آزمائش کے لئے بھی اللہ میاں نے شروع ہی سے کچھ لوگوں کو مخصوص کر رکھا ہے، اور ان ہی مخصوص لوگوں میں اماں بھی شامل تھیں۔ جن کی روح پر ازل ہی سے کاتب تقدیر نے آزمائشیں رقم کر دی تھیں۔ وہ اگر اپنی زندگی پر نظر ڈالتیں تو بس کتنی کے چند سال ہی ایسے ملتے جن میں وہ قدرے پرسکون رہی تھیں۔ اور وہ سال حق نواز کی ابا کی مہر ای میں کٹے تھے۔ اس سے پہلے اور بعد میں وہ ہمیشہ حالات کی چکی میں پستی رہی تھیں۔ لیکن کمال یہ تھا کہ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹے نہیں دیا۔

اب جو عرفان حق نواز کو لے گیا تو ان کی امیدیں ایک بار پھر روشن ہو گئیں۔ وہ حق نواز کے لئے دعا گو تو تھیں ہی اس کے علاوہ جو خواب انہیں عرفان دکھا گیا تھا۔ وہ بھی خاصا، خوش کن تھا۔ یعنی حق نواز کی شادی۔

ہر ماں کی طرح انہیں بھی بیٹے کی شادی کا ارمان تھا۔ جو کل تو پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن آج جب امیدیں روشن ہوئیں تو ہر طرف سے جیسے شہنائیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔
 دو دن انہوں نے بڑی مشکل سے گزارے اور تیسرے دن جب عرفان انہیں حق نواز کی خیریت سے آگاہ کرنے آیا تو وہ اس کے سر ہو گئیں۔
 ”مجھے مہاجر کمپ لے چلو۔“

”ابھی سے.....“ وہ حیران ہوا۔ ”نواز کو ٹھیک تو ہونے دیں۔“
 ”وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ یقین سے بولیں۔ ”میرا دل کہتا ہے، وہ اب جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہاری دعائیں ساتھ رہیں اماں، تو ایسا ہی ہوگا۔“

”تو پھر مجھے لے چلو۔“ انہوں نے اصرار کیا اور پھر یہ اصرار اتنا بڑھا کہ عرفان کو ان کی بات مانی پڑی۔ جہاں اس نے چلنے کی حامی بھری وہ جھٹ برقعہ اوڑھ کر تیار ہو گئیں، عرفان ان کی جلد بازی اور پھرتی پر حیران ہوا۔ اور یوں انہیں دیکھ رہا تھا جیسے ان میں اچانک کوئی نئی روح سما گئی ہو۔ کمپ میں اماں کسی بے سہارا لڑکی کی تلاش میں گئی تھیں۔ لیکن پہلے ہی مرحلے پر وہ ایک نوجوان کو دیکھ کر رک گئیں، جو اپنی آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

وہ..... خضر حیات تھا جو روتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کتنی آرزو تھی اماں اور ابا کو ان آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی۔ اماں کے ہونٹوں پر ہر دم پاکستان بننے کی دعائیں مچلتی تھیں، اور ابا ”بن کے رہے گا پاکستان“ کے نعرے لگایا کرتے۔ ان کی آواز ہمیشہ اُونچی ہوا کرتی تھی۔ جیسی تو سب حیات محمد کے قافلے کے راہ دیکھ رہے تھے۔

”بیٹا.....! آزادی کے لئے قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔ اور پھر تمہاری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔“ کسی مہربان نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس مٹی کے ناتے اپنائیت کا احساس اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ اور وہ بہت حد تک سنبھل گیا۔

اماں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں شاید ان کے تصور میں اپنا حق نواز تھا۔ اگر جو وہ بری صحبت کا شکار نہ ہوتا تو ایسا ہی جوان نکلتا۔ ان کی مامتا اسے بھی اپنی آغوش میں لینے کو مچنے لگی۔ بے اختیار اس کی طرف بڑھیں اور اس کا بازو تھام لیا۔

”بیٹا.....! یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔“ اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ خضران کی طرف دیکھے گیا۔

”کہاں جاؤ گے.....؟“ وہ پوچھنے لگیں۔

”کچھ پانچیں قسمت کہاں لے جاتی ہے۔“ وہ کہنے لگا۔

”کوئی رشتہ دار.....؟“

”نہیں کوئی نہیں ہے۔“

”میرے ساتھ چلو..... میرا گھر ہے، جب تک دل چاہے رہنا۔“ انہوں نے خلوص سے پیشکش کی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”اکیلے ہو.....؟“ اماں نے پوچھا تو اسے پوجا کا خیال آیا جو اس کے پیچھے چپ چاپ کھڑی تھی۔

”نہیں یہ میرے ساتھ ہے۔“ اس نے پوجا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔

”تمہاری بیوی ہے.....؟“ وہ پوچھنے لگیں۔

”نہیں..... ابھی شادی نہیں ہوئی۔“ اس نے سچ بولا۔

”اچھا اچھا.....!“ اماں نے سر ہلایا جیسے ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی ہو، پھر کہنے لگیں۔

”میرے ساتھ چلو..... جب تک کوئی ٹھکانا نہیں ہو جاتا میرے گھر رہنا۔“

”آپ کو تکلیف ہوگی۔“

”ارے تکلیف کیسی بیٹا.....! بچوں کے آنے سے تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج کل میرا آواز بھی گھر پر نہیں ہے، تم آ جاؤ گے تو میرا کیلا پن دور ہو جائے گا۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پوجا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لگا گیا۔

”جو ان لڑکی کو لے کر کہاں مارے مارے پھرو گے آؤ میرے ساتھ۔“

وہ پوجا کو لیے آگے بڑھ گئیں۔ اور وہ کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چل پڑا۔

”اماں وہ لڑکی.....“ خضران نے انہیں یاد دلانا چاہا کہ وہ کس مقصد سے یہاں آئی تھیں۔

”کون سی لڑکی.....؟“

”تو اس کے لئے۔“

”ہاں ہاں.....! وہ بھی آ کر دیکھ لوں گی، ابھی تو گھر چلو۔ بچے اتنی دور سے آئے ہیں۔“

”تک بھی گئے ہوں گے۔“ وہ بولیں بولیں جیسے سچ سچ ان کے اپنے بچے نہیں دور سے آئے ہوں۔

خضران نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر قدم روک کر خضر کے ساتھ ہولیا۔

”اے اپنا ہی گھر سمجھو۔“

اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا تو وہ دونوں چھوٹے آنکھن میں کھڑے نظروں کا زاویہ بدل بدل کر گھر کا جائزہ لینے لگے۔

گھر خواہ کیسا بھی تھا، فی الحال رہنے کو ٹھکانا مل گیا تھا۔ ان کے لئے یہی بہت تھا۔

”تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو بیٹا۔“ اماں انہیں چپ چاپ کھڑے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”نہانا چاہو تو نہالو، تھکن اتر جائے گی۔“

”پہلے آپ نہالیں۔“ وہ کہتی ہوئی اماں کے پاس جا بیٹھی۔ اماں رات کے کھانے کی تیاری

کر رہی تھیں۔ وہ ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود ہاتھ بٹانے لگی۔

پھر جب کھانا وغیرہ کھا کر فراغت سے بیٹھے تو مسافروں کی تھکن غالب آگئی۔ گرمیوں کے

دن تھے۔

خضر نے آنکھن میں سونے کی خواہش کا اظہار کیا، تو اماں پوجا کو لے کر اندر چلی گئیں۔

آسمان پر جھللاتے ستاروں کے قافلے اترے چلے آ رہے تھے۔ ابتدائی تاریکیوں کا چاند

بہت جلد اپنا سفر تمام کر گیا تھا۔ اسی لئے اب ستاروں ہی کی حکمرانی تھی۔ وہ سیدھا لینا جھللاتے

ستاروں سے ان ہستیوں کا پتا پوچھنے لگا جو بیچ راہ میں اچانک اس سے بچھڑ گئی تھیں۔

”اماں.....! ابا.....! بڑے بھیا!“ وہ بے آواز صدائیں دینے لگا، اور یونہی پکارتے

پکارتے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اور.....

سونا تو وہ بھی چاہتی تھی لیکن نیند مہربان ہو کے نہیں دے رہی تھی۔ اجنبی دیس، اجنبی ماحول

کی اجنبی فضا میں اور اجنبی لوگ۔ وہ خوفزدہ نہیں تھی، لیکن کیونکہ ابھی اپنائیت کا احساس نہیں جاگا

تھا۔ اس لئے کچھ بھی اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہیں اس نے خضر کے ساتھ آکر غلطی تو نہیں

کی لیکن اب یہ سب سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کیونکہ سب کشتیاں تو جل ہی چکی تھیں۔

وہ مسلسل کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی۔ بدن دکھنے لگا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، ساتھ والی

چارپائی پر اماں بے خبر سو رہی تھیں اور گہری خاموشی میں باہر سے خضر کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز

اندر تک آرہی تھی۔ اچانک اسے ڈر لگنے لگا تو اس نے اٹھ کر اماں کا کندھا ہلا ڈالا۔

”کیا ہوا.....؟“ اماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

”مجھے نیند نہیں آرہی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ان کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔

”ارے ارے.....!“ اماں ایک دم پریشان ہو گئیں۔

”تم رونے کیوں لگیں بیٹا.....؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یونہی روتی رہی۔ شاید دل کا بوجھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ جسے وہ آنکھوں کی راہ ہلکا کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب اس کی سسکیاں دم توڑ گئیں اور آنکھوں نے مزید برسنے سے انکار کر دیا تب وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”مجھے ماما جی یاد آ رہی ہیں۔“ اس نے اپنے رونے کا عذر تراشا اور اماں اس کے منہ سے ماما جی کا لفظ سن کر چونک گئیں۔

”کون ہو تم.....؟“

”پوچھا.....!“

”کیا خضر تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لایا ہے.....؟“ اماں کو شبہ ہونے لگا۔

”نہیں..... میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔“

پھر اس نے انہیں ساری بات بتا دی۔ اماں خاموشی سے اس کی رام کہانی سنتی رہیں۔ جب وہ خاموش ہوئی تو کہنے لگیں۔

”اب تم سو جاؤ۔ میں صبح تم سے بات کروں گی۔“

”کوئی تبصرہ نہیں، کوئی ملامت نہیں۔“ وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے جب آہی گئی ہو تو یہی تمہاری زمین اور یہی تمہارا گھر ہے۔“

اماں نے تسلی دی اور پھر اسے اپنے ساتھ ہی لٹالیا۔ ان کے پر شفقت سینے میں منہ چھپایا تو جہاں اجنبیت کی دیواریں گریں، وہاں نیند بھی مہربان ہو گئی۔

گو کہ رات وہ بہت دیر سے سوئی تھی، اس کے باوجود صبح بہت جلدی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اماں کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن سی لیٹی رہی، پھر اٹھ کر کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ اماں برآمدے میں جا نماز پر بیٹھی۔ نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ انہیں اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ بہت خاموشی سے ان کی حرکت کرتی انگلیوں اور ایک کے بعد ایک گرتے دانوں کو دیکھنے لگی۔ پھر تسبیح رکھ کر انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیے، تو اس کی نظریں ان کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ ہلے ہونٹوں سے الفاظ موتیوں کی صورت نکل رہے تھے۔

”میرا اللہ تو کل کائنات کا مالک ہے، جسے چاہتا ہے اپنے راستے کی آگاہیاں عطا کرتا ہے، ہم سب تیرے گناہ گار بندے ہیں، تو اپنی رحمتوں سے ہمارے گناہوں کو بخش دے، کہ تو بخشنے والا

مہربان ہے۔“

انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

”جاؤ..... منہ ہاتھ دھو لو۔“

انہوں نے اٹھ کر جا نماز بیٹھی، پھر اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”تمہارے کپڑے بہت میلے ہو رہے ہیں۔ کیا خضر کے بیک میں تمہارے کپڑے نہیں

ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا، میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اندر چلی گئیں۔ اور اپنا اچھے دنوں کا ایک سوٹ نکال کر لے

آئیں۔

”لو..... نہا کر اسے پہن لو۔“

اس نے چپ چاپ ان کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ جس وقت وہ نہا کر نکلی تو خضر اٹھ چکا تھا اور اماں اس کے پاس بیٹھی جانے کیا بات کر رہی تھی، کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں، اماں کے خاموش ہونے پر خضر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر جیسے نظریں ہٹانا بھول گیا۔ اس کا بھیگا بھیگا سراپا تپتے وجود پر جیسے پھوار برسانے لگا۔ اب نہ مٹنے والے فاصلوں کا احساس نہیں تھا۔ اس لئے وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ پھر اماں کا خیال کر کے سیدھ ہو بیٹھا۔

”یہیں آ جاؤ بیٹا.....!“ اماں نے اسے شش و پنج میں دیکھ کر بلایا۔ تو وہ قدرے جھجکتی ہوئی

ان کے پاس آ بیٹھی۔

”ہم ابھی تمہارے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔“

اماں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

”اب جبکہ تم اپنا..... گھریار اور دیس چھوڑ آئی ہو، تو ظاہر ہے ہم تمہیں بے یار و مددگار تو

نہیں چھوڑیں گے۔ خضر تم سے شادی کا خواہش مند ہے اور میرا خیال ہے تم بھی اس کی خاطر یہاں

تک آئی ہو، تو کیا اس کی خاطر تم اپنا دھرم۔“

اماں خاموش ہو گئیں اور وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی۔

”کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا.....! کیونکہ ہمارے مذہب میں زبردستی جائز نہیں ہے۔ ہاں

اگر تم خوشی سے قبول کرو تو۔“

”پوجا.....! تم اچھی طرح سوچ لو۔“ وہ کہنے لگا۔ اور سوچتے ہوئے یہ خیال کبھی دل میں مت لانا کہ اگر تم نے اپنا دھرم نہ چھوڑا تو ہم تمہیں بے آسرا چھوڑ دیں گے۔“

”مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے خضر بابو۔ کیونکہ میں اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئی ہوں۔ گھر اور دس کے ساتھ دھرم بھی۔“

خضر اور اس کے ساتھ اماں بھی کتنی دیر تک چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ جو اپنی بات کہہ کر بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

”تو کیا تم بخوشی.....“ وہ یقین چاہتا تھا۔

”ہاں.....!“

”ہاں.....!“

”ہاں.....!“ وہ یقین دلاتی گئی۔

اماں نے اسی وقت عرفان کو بلایا۔ پھر اس کے ہاتھ مولوی صاحب کو بلا بھیجا۔ جن کے سامنے اس نے خضر کے یقین پر مہر ثبت کر دی۔ اور شام میں چند لوگوں کی موجودگی میں اس نے ایک بار پھر اک ذرا سی ہاں کو تین بار دوہرا کر اپنے تمام جملہ حقوق خضر کو سونپتے ہوئے درمیانی فاصلے سیٹ لیے۔

پھر اپنی سر زمین پر نئی زندگی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جسے دیکھ کر ایمان ڈولنے لگتا تھا۔ جب اس پر ایمان لائی تو زندگی کچھ سہل ہو گئی۔ ورنہ وہ اکیلا کبھی بھی اتنی جلدی زندگی کی طرف نہیں لوٹ سکتا تھا۔

اور..... وہ شاید آئی ہی اس لئے تھی کہ اس کے لوگوں نے جو زخم اس کی ذات پر لگائے تھے وہ ان کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔ گو کہ وہ اکیلا زخم خوردہ نہیں تھا پھر بھی وہ تباہ لڑکی اس حد تک ہی کر سکتی تھی۔ ہر مقام پر اس کے زخموں پر اپنی محبتوں کے نرم نرم پھاہے رکھ کر اسے یہ احساس دلاتی کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

وہ دونوں زیادہ دن اماں پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس لئے خضر نے فوری طور پر جاب کی تلاش شروع کر دی۔ قسمت مہربان تھی بہت جلد اسے معمولی سی لیکن نوکری مل گئی اور پہلی تنخواہ پر ہی اس نے الگ گھر کا انتظام کر لیا۔ اماں روکتی رہ گئیں۔ بے شک ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مزید ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ویسے بھی نواز کافی حد تک بہتر ہو گیا تھا اور اب ماں کو اس کا گھر بھی بسانا تھا۔ ایسی صورت میں اس چھوٹے سے گھر میں ان کے لئے ویسے بھی گنجائش نہ رہتی۔

”بیٹا.....! آتے جاتے رہو گے ناں۔“ اماں واقعی ان کے جانے سے بہت آزرده تھیں۔

”ہاں..... اماں.....! کوئی بہت دور تو نہیں جا رہے ہم، اسی شہر میں ہیں اور پھر آپ کے سوا ہمارا ہے ہی کون۔“

خضر نے کہا پھر دعائیں لینے کی خاطر ان کے آگے جھک گیا۔ اماں نے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعائیں دیں پھر پوجا کو جواب صالحہ یکلم تھی..... سینے سے لگا لیا۔

”خدا تم دونوں کو اپنی امان میں رکھے۔“

ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک اماں انہیں دعائیں دیتی رہی تھیں۔

○ ○ ○

اب اماں کو حق نواز کی فکر تھی..... اور جس روز عرفان نے آکر بتایا کہ اب بس دو ایک دن میں وہ اسے یہاں لے آئے گا۔ اسی روز اماں ایک بار پھر مہاجر کیمپ جانے کو تیار ہو گئیں۔

”اماں.....! میں تو کہتا ہوں پہلے یہیں محلے میں کہیں بات کر دیکھو“ عرفان نے مشورہ دیا تو وہ کہنے لگیں۔

”بیٹا.....! میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی کوشش کر چکی ہوں۔“

”پھر.....؟“

”کوئی بھی تیار نہیں۔ سب کہتے ہیں۔ ہم نے اپنی لڑکی کے نصیب نہیں پھوڑنے۔“

”تم نے بتایا نہیں کہ نواز اب ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”بتایا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں، کتنے دن ٹھیک رہے گا۔ پھر اسی راستے پر چلنے لگے گا۔“ پھر اندیشوں میں گھر کر پوچھنے لگیں۔ ”کیا لوگ ٹھیک کہتے ہیں؟“

”نہیں اماں.....! تم کسی کی باتوں پر یقین مت کرو۔ اللہ چاہے گا۔ وہ اب اچھا ہی رہے گا۔“ عرفان نے تسلی دی۔

”تم ہی کہیں بات کر دیکھو۔“ اماں اس سے کہنے لگیں۔

”جب تمہاری بات لوگوں نے نہیں مانی تو میری کیا مانیں گے خیر چھوڑو! لڑکیاں بہت مل جائیں گی۔ چلو چلتے ہیں۔“ اس نے کہا تو اماں جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

پھر جب اماں ایک بے سہارا لڑکی کو گھر لائیں تو سب ہی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے تھے۔ ایسی لڑکی تو اس پورے محلے میں کہیں نہ تھی۔ سفید رنگت جو یقیناً کبھی گلانی بھی رہی ہوگی۔ اور جو

”اماں.....!“

وہ اب پہلے کی طرح آواز دینے کے ساتھ فوراً اندر نہیں آتا تھا۔ گوکہ اماں نے اسے منع نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ خود ہی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

”تم اندر جاؤ بیٹی.....!“ اماں نے کہا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اور اس کے جاتے ہی اماں نے عرفان کو بلا لیا۔

”کیسے آئے بیٹا.....؟“ اماں پوچھنے لگیں۔

”نواز کے کوئی ڈھلے ہوئے کپڑے ہوں تو دے دو۔“

”بیٹھو..... میں لے کر آتی ہوں۔“ اماں اٹھ کر اندر چلی گئیں، پھر کچھ دیر بعد ہی کپڑے لے کر آ گئیں۔

”بیٹا.....! بہت دن ہو گئے ہیں نواز کو دیکھے ہوئے۔“

”بس ابھی لا رہا ہوں اسے۔“

”اچھا.....!“ اماں ایک دم خوش ہو گئیں۔ ”ٹھیک تو ہے میرا بچہ.....“

”ابھی آئے گا تو خود ہی دیکھ لینا۔“ وہ اماں کے ہاتھوں سے کپڑے لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلتا ہوں۔“

”اچھا.....!“ اماں نے ہمیشہ کی طرح اسے رکنے کے لئے نہیں کہا۔ وہ چلا گیا تو اماں جلدی

جلدی تخت پوش پر پھیلے کپڑے سمیٹنے لگیں۔ ساتھ ہی اسے بھی آواز دے ڈالی۔

”مہر النساء بیٹی.....! بکس سے صاف چادر نکال کر بچھا دو۔ ابھی میرا حق نواز آنے والا

ہے۔“

”حق نواز.....!“ کانوں نے سنا ہونٹوں نے دہرایا۔ اور دھڑکنوں نے شور مچا دیا۔ وہ

اٹھی اور بکس سے چادر نکال کر بچھانے لگی۔ اس دوران اماں اندر آئیں۔ پھر فوراً ہی پلٹ بھی

گئیں۔

بوکھلا ہٹ میں انہیں کچھ بچھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک پیر اندر ایک چیر باہر۔ کوئی چوتھی بار وہ

اندر آئیں تو دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ”آگیا“ کہتی ہوئی وہ باہر کی طرف لپکیں جبکہ وہ وہیں

کھڑی انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد اس کے کانوں نے کسی کے رونے کی آواز سنی تو وہ بڑھ کر کمرے کے دروازے

تک آ گئی۔ شاید وہی حق نواز تھا جو اماں کے کندھے سے لگا رہا تھا اور اپنے گزشتہ رویے کی معافی

مانگ رہا تھا۔ اور اماں کے ناتواں بازوؤں میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس کے

حالات نے اس سے چھین لی۔ سیاہ پلکوں کے حصار میں بڑی بڑی آنکھیں، شکر فی ہونٹ اور ہونٹوں کے کنارے سیاہ تل جس نے اس کے چہرے کو انوکھا حسن بخش دیا تھا۔

”یہ مہر النساء ہے۔“ اماں ہر آنے والی خاتون سے اس کا تعارف کراتیں۔

”ماشاء اللہ.....“ دیکھنے والوں کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلتا۔

اور مہر النساء.....!

حالات کی ستائی ہوئی مظلوم لڑکی۔

پتا نہیں شروع ہی سے ایسی کم گوشتی یا حالات نے اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیے تھے۔

خاموش چپ چاپ سب کو ٹکا کرتی۔ اس نے اپنے حالات نہیں بتائے تھے اور نہ ہی اماں نے

اسے کریدنے کی کوشش کی تھی۔ شروع کے ایک دو دن وہ خاصی خوفزدہ اور سہمی سہمی سی رہی۔ شاید

یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے ایک سا بنام میسر آ گیا ہے۔ لیکن اماں کی محبتوں اور شفقتوں نے بہت

جلد اس کے دل سے ہر قسم کا خوف دور کر دیا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اور اسی گھر کو مقدر جان کر

شاکر بھی ہو گئی۔

صبح ناشتے کے بعد جب اماں مشین لے کر بیٹھیں تو وہ ان کے پاس آ کر کہنے لگی۔

”آپ ہٹ جائیں اماں! میں سی دیتی ہوں۔“

”تم۔“ اماں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”مجھے سینا آتا ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”یہ تو اچھی بات ہے، لیکن یہ کپڑے تمہارے سینے کے لئے نہیں ہیں۔“

”کیوں.....؟“

”یہ میں اجرت پری رہی ہوں۔“

”تو کیا ہوا..... میں بھی آپ کا ہاتھ بنا دوں گی۔“

”نہیں بیٹا.....! تمہیں میں بہو بنانے کو لائی ہوں، اور میری تو کیا حق نواز کی غیرت بھی

گوارا نہیں کرے گی کہ تم یہ کام کرو۔“

”یہ کوئی برا کام تو نہیں ہے۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”محنت کا کوئی کام بھی برا نہیں ہوتا بیٹی.....! لیکن میرے ہوتے ہوئے تم کرو۔ یہ اچھا

نہیں لگتا..... اور پھر اللہ رکھے میرے حق نواز کو، وہ کمائے گا۔“

وہ سر جھکائے دوپٹے کا کوتا انگلی پر لپیٹنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور عرفان

نے وہیں سے آواز دی۔

پورے وجود کو سہارا دیے کھڑی تھیں۔ پھر جیسے ہی وہ اسے لیے ہوئے پلٹیں۔ وہ چپ چاپ دروازے سے ہٹ کر اندر آ گئی۔

اماں، نواز اور عرفان کو لے کر برآمدے میں تخت پوش پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ وہ عرفان کی بہت مشکور تھیں، اور مسلسل اسے دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔

”بس کرو اماں.....! میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔“ اماں کی دعاؤں کے ساتھ تعریفوں سے وہ شرمندہ ہونے لگا۔ تو موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

”اب تو نوازی کی شادی کی بات کرو اور میں تو کہتا ہوں اسی جمعہ کو۔“

”کیا کہا.....؟“ نواز فوراً بول پڑا۔ ”کیسی بات کرتے ہو عرفان بھائی!“

”عرفان ٹھیک کہہ رہا ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔“

اماں نے کہا تو وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”اماں پہلے مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونے دیں، پھر شادی کی بات کیجئے گا۔ ورنہ میں

کہاں سے کھلاؤں گا اسے۔“

”کھلانے والا اللہ ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ ہاں کوشش کرو۔ جلد کہیں کام مل جائے لیکن تمہارے کام ملنے تک میں اسے یونہی نہیں بٹھائے رکھ سکتی۔“

”کسے.....؟“

”مہر النساء کو.....“

”مہر النساء.....!“ اماں کی پہیلیاں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ الجھ کر پوچھنے لگا۔

”یہ مہر النساء کہاں سے آ گئی.....؟“

پھر اماں نے اسے مہر النساء کے بارے میں بتایا اور خضر اور پوجا کا ذکر بھی کیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس دوران اس کی نظریں بار بار اس دروازے کی طرف اٹھ جاتیں، جس کے دوسری طرف مہر النساء تھی۔

”پھر بھی اماں.....!“ وہ پوری بات سننے کے بعد کہنے لگا۔ ”پہلے مجھے کام پر لگنے دیں۔“

”کام بھی لگ جائے گا۔ آخر خضر نے بھی تو کام لگنے سے پہلے شادی کی، اور پھر شادی ہو جائے گی تو مہر بھی گھر میں آزادی سے رہے گی۔“

اماں کی یہ بات مناسب تھی، عرفان نے بھی تائید کی، اور ان دونوں کے آگے اسے خاموش ہونا پڑا۔

پھر جمعہ کی شام بہت سادگی سے چند لوگوں کی موجودگی میں حق نواز اور مہر النساء کا نکاح ہوا،

چند لوگ جنہوں نے شرکت کی ان میں خضر اور صالح بھی شامل تھے۔ اماں نے خاص طور سے عرفان کو بھیجا تھا بلوانے کو۔

○ ○ ○

وہی صبحیں تھیں اور وہی شامیں، لیکن موسم بدلنے سے ان کے انداز اور مزاج بدل گئے تھے۔ صبحیں کہہ میں ڈوبی ہوئی اور شامیں ڈھیر ساری خنکی لیے آتیں۔ اسی بدلتے موسم نے وقت گزرنے کا احساس بھی دلایا۔ اوائل فروری کی خنک کسی شام کو باورچی خانے میں لکڑیوں سے آگ جلاتے ہوئے صالح نے خضر سے کہا۔

”ہماری شادی کو چھ ماہ ہو گئے ہیں۔“

”اچھا.....!“ وہ چونکا پھر کہنے لگا۔ ”اتنی جلدی چھ مہینے گزر گئے۔ مجھے تو ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔“

”ارے.....!“ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔ ”تم اسے جلدی کہتے ہو۔ جبکہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اپنے لوگوں کے درمیان سے آئے ہوئے، انہیں دیکھے ہوئے۔“

”صالح.....! کیا تمہیں اپنے لوگ بہت یاد آتے ہیں؟“

وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تو وہ جواب دینے کے بجائے جھک کر لکڑیوں کے درمیان پھونکیں مارنے لگی۔ جو تھوڑی بہت آگ جل رہی تھی۔ وہ بھی جھگڑی اور ایک دم بہت سارا دھواں اٹھنے لگا جس سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ پھر بھی باز نہیں آئی۔ آگ جلا کر ہی دم لیا۔ اور جب سیدھی ہوئی تو آنکھوں سے بے تحاشا پانی بہہ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بہتے پانی کا سبب سوچتا رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہو.....؟“ اس کے پوچھنے پر اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”کیا تمہیں اپنے لوگ بہت یاد آتے ہیں۔“

”نہیں..... بہت تو یاد نہیں آتے، بس کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے۔“

”تمہارا دل چاہتا ہے ان سے ملنے کو۔“

”دل چاہے گا بھی تو کیا کروں گی۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کرنے لگی۔

”سنو.....! اگر کبھی تمہارا دل ان سے ملنے کو چاہے اور تم وہاں جانا چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“

”کبھی موقع ملا تو دونوں چلیں گے۔“ اس نے بات ختم کر دی، اور وہ بھی مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ زندگی جب کافی حد تک معمول پر آگئی تو وہ اپنی ذات سے نکل کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی سوچنے لگے۔ درنداب تک تو وہ اپنی ذات تک ہی محدود تھے۔ خضر جو معمولی جاب کر رہا تھا اسے اپنی جائیداد کا خیال آیا جو وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ اور یہاں اس کی خوش قسمتی تھی کہ کاغذات اسی کے پاس تھے، جن کے ذریعے اس نے کلیم کر دیا۔ اور پھر جس روز صالہ نے احتشام کو ختم دیا، اسی روز اس کا کلیم منظور ہوا۔ قسمت مہربان ہو تو راہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا، کسی مقام پر کوئی تردد نہ ہوا، نہ کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر کام خود بخود جیسے آسان ہوتا گیا۔ انہیں پوری جائیداد کے برابر نہ سہی آدھی یا اس سے کچھ کم جو بھی ملا۔ وہ ان کے لئے بہت کافی تھا۔ اس رات وہ دیر تک اپنی آئندہ زندگی کا پلان بناتے رہے۔

”ایسا کرو خضر.....! سب سے پہلے اپنا گھر بنانے کی سوچو۔“ وہ کہنے لگی۔

”ہاں.....! میرا بھی یہی خیال ہے۔ اپنا گھر بنالیں، اس کے بعد میں کوئی بزنس کرنے کی سوچوں گا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”تمہارے ذہن میں اپنے گھر کے لئے کوئی تصور ہو تو کہو۔“

”میں کیا کہوں۔“

”نہیں صالہ.....! ہر لڑکی ایک گھر کا تصور لے کر ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر بڑھتی عمر کے ساتھ وہ اسے اپنی خواہش کے مطابق سجاتی سنوارتی ہے۔ تم اپنی خواہش کو بلا جھجک زبان دے دو۔“

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی پھر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہی جیسے اس نے خوابوں کے اس جزیرے میں قدم رکھ دیے ہوں۔ جسے اس نے پلکوں پہ سجایا تھا۔ اس وقت جب وہ پوچھا تھی۔

جب آئیں من آگن میں پلچل چایا کرتیں۔

جب انجانے میں کوئی خشک ہتا ہیر کے نیچے آجاتا تو دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا تھا۔

اور.....

جب نئی کوٹلیں پھونٹیں تو پہنوں کے رنگ آپ ہی آپ گہرے ہو جاتے تھے۔

قدموں نے خواب جزیروں کو کیا چھو کہ وہ مکمل طور پر ان کی گرفت میں آگئی، اور جب بولی تو لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ اور انداز وہی پرانا۔

”خضر.....! تم ٹھیک کہتے ہو، سنے سجانے میں ہم لڑکیاں اپنا جانی نہیں رکھتیں۔ میں

نے بھی سنے سجانے، اور شاید تم وشواس نہ کرو کہ میرے پہنوں میں تم شروع ہی سے میرے ساتھ رہے۔ اس وقت مجھے اپنے اور تمہارے درمیان نہ مٹنے والا فاصلہ حائل نظر آتا تھا۔ اس لئے پہلے پہل میں اپنے پہنوں سے خوفزدہ ہوئی، پھر کوشش کی کہ تمہیں نہ سوچوں لیکن مجھے کسی بھی طرح اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی، پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو شانت کیا کہ پیدائشی تو ہے جسے میری ہی آنکھیں دیکھتی ہیں، کوئی اور کہاں جان سکے گا۔“

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھ گیا، اور وہ اس گھر کا نقشہ کھینچنے لگی۔ جسے وہ تصور میں دیکھتی تھی۔

○○○

حق نواز اور مہر النساء کی شادی کو بھی ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ نوازا اب تک بیکار تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس نے کام کے لئے کوشش نہیں کی، وہ اپنی سی ہر کوشش کر چکا تھا۔ لیکن کہیں قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اس طرف قسمت مہربان تھی تو اس طرف نامہربان۔ وہ صبح سے شام تک کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور جب شام گئے مایوس لوٹتا تو اس کے حوصلے جواب دے چکے ہوتے۔ ایسے میں اماں اور پھر مہر النساء اسے نئے سرے سے حوصلہ دیتیں۔

جس طرح مہر و اچانک اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اسی طرح اچانک اس پر چھا گئی تھی اس کی کم خنی اور خدمت گزاری سے وہ بہت متاثر تھا۔ اور چاہتا تھا کہ جس طرح وہ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے لوث خدمت کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی اس کے لیے کچھ کرے اور اس کے لیے کچھ کرنے کی لگن ہی میں وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا تھا۔ اس کا یہی معمول تھا۔ روزانہ ایک نئی امید لے کر جاتا لیکن اب تو ساری امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔

”مہر.....! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔“ وہ مایوس ہو گیا تھا۔

”ارے.....! ابھی تو زندگی پڑی ہے۔ تم ابھی سے ایسی باتیں کرنے لگے۔“ مہر نے مسکرا کر حوصلہ دیا۔

”یہی تو دن تھے، جب میں تمہیں بے فکری کی زندگی دیتا۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں بھولنے کے دن فکر معاش کی نذر ہوئے جاتے ہیں۔“

”کیسے..... کیسے ٹھیک ہو گا سب.....؟“

”مایوسیوں میں مت گہر و نواز۔! کسی نہ کسی دن تمہاری کوششیں ضرور بار آور ہوں گی۔“ وہ اس کے چہرے پر چھائے آرزوگی کے بادل دیکھ کر خود بھی دھکی ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس

کی دلجوئی کرتی رہی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے، اس صبح وہ اٹھا تو مہر وہ اس وقت تک سو رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو اس سے بہت پہلے اٹھ جایا کرتی تھی۔

”مہر.....!“ اس نے پکارا اور پھر مسلسل پکارنے پر بھی وہ نہیں اٹھی۔ تو پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہی احساس ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہو رہا ہے، وہ پریشان ہوا، اور فوراً اماں کو بلا لایا۔ اماں کیا کر سکتی تھیں بس ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ہی اس کے ماتھے پر رکھتی رہیں۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بخار کی شدت میں کچھ کمی ہوئی اور وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی تھی۔

”تم اس کے پاس بیٹھو..... میں چائے بنا لاتی ہوں۔“ اماں اٹھ کر چلی گئیں تو وہ اس سے کہنے لگی۔

”تم آج گئے نہیں.....؟“

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر کیا کروں جا کر۔ یونہی خوار ہو کر تو واپس آ جاتا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے، آج کوئی بات بن جاتی۔“ وہ ہر صبح یہی جملہ بولتی تھی۔ اور پھر عرفان بھائی نے بھی تو کہا تھا کہ۔

”عرفان کے پاس میں کل ہی گیا تھا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

”کہہ رہا تھا۔ ابھی جبکہ خالی نہیں ہوئی۔“

”اچھا.....!“ وہ طویل سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

”پہلے میں تمہاری دوا لے آؤں۔“ وہ کمرے سے نکل کر اماں کے پاس آ گیا۔

”اماں مہر کی دوا۔“ وہ اتنا کہہ کر ہی خاموش ہو گیا۔

”بیٹا! میرے پاس تو آج پیسے نہیں ہیں۔ ہاں ذکیہ کی اماں نے شام کو دینے کو کہا ہے وہ بھی اگر ذکیہ کے ابا کو مل گئے تب۔“

”اچھا.....!“ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”مہر کو اس وقت دوا کی ضرورت ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ کہیں مزدوری ہی مل جائے

تو.....“ وہ مزید کچھ کہنے سے بغیر گھر سے نکل گیا۔

شہر میں جہاں جہاں کام ہوتا نظر آیا۔ وہ وہیں رکا۔ سب سے بات کی اور کہیں بات نہیں

ہی۔

دوپہر ڈھلی، پھر شام ہوئی۔ لوگ کام بند کر کے گھروں کو جانے لگے، وہ اب کس آس پر رکتا۔ قدموں کو واپسی کے لیے مڑا تو مہر کا خیال آیا۔

اسے دوا کی ضرورت تھی اور وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ دل بوجھل ہوا اور واپسی کے لئے اٹھتے قدم رک گئے۔

”کیا آج بھی اس کے سامنے اپنی مایوس صورت لے کر جاؤں۔“ آرزوگی سے سوچتا ہوا وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں آتے جاتے لوگوں کے چہروں پر بھٹک رہی تھیں۔

دن بھر کی مشقت کے باوجود ہر چہرے پر ایک اطمینان تھا اور گھر جانے کی جلدی۔ وہ حسرت سے دیکھتا رہا۔ شام گہری ہوئی اور پھر رات کی سیاہی پھیلنے لگی، وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ حقیقت میں اس میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

”لو یار.....! مارو دم..... منے غم.....“

وہ خالی خالی نظروں سے اپنی طرف بڑھے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

”لونا.....!“ اصرار بڑھا اور وہ انکار کی طاقت کھو بیٹھا۔

”میں یونہی بھٹکتا پھر رہا تھا۔“ کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ”مہر کی دوا نہیں ہے۔ اماں کے پاس پیسے نہیں ہیں، اور میں بغیر پیسوں کے دوا کہاں سے لاؤں، جسے ضرورت ہو گی خود ہی آئے گا۔ میں کیوں سارے جہاں کا غم بانٹتا پھروں۔“ جو جی میں آیا بولتا گیا۔ شاید بہت دنوں سے اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ اور اب جو بولنے پہ آیا تو کسی طرح خاموش ہی نہیں ہوا۔ گو کہ سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اور اسے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔

اماں اور مہر نے اس کی راہ دیکھتے دیکھتے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ وہ دونوں ہی پریشان تھیں۔ کہ آخر کہاں چلا گیا ہے۔ صبح ہوتے ہیں اماں نے عرفان کو بلا بھیجا اور ابھی اسے اس کی تلاش میں بھیجنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ آ گیا۔

”کہاں رہ گئے تھے تم.....؟“ اماں فوراً اس کی طرف لپکیں۔

”کام کی تلاش میں گیا تھا۔“

”رات میں کون سا کام تلاش کرتے رہے.....؟“ وہ جواب دینے کے بجائے اندر چلا

گیا۔ جہاں مہر اس کی منتظر تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا لیٹ ہو گیا۔

”کیا ہوا نواز.....؟“ وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں.....“ اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ کچھ دیر بعد اماں اندر

آئیں تو وہ سو رہا تھا۔

”پتا نہیں بے چارا کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہے۔ جو یوں تھک کر سو گیا ہے؟“ بے چاری مانتی کی ماری اس کے لئے پریشان ہو گئیں۔

پھر یہ حالات ہی تھے جنہوں نے اسے دوبارہ پرانے راستے پر چلنے پر مجبور کیا۔ اتنے ڈیر سارے مسائل، پریشانیاں، دکھ، وہ کس کس کا سامنا کرتا۔

اماں کی جھگی ہوئی کمر۔

مہرو کی آنکھوں میں امیدوں کے بجھتے چراغ۔ سب سے نظریں چرانے کا یہی راستہ تھا، جس پر وہ آنکھیں بند کر کے چل پڑا۔

شروع شروع میں کسی کو پتا ہی نہیں چلا، اور جب معلوم ہوا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔

○ ○ ○

صالیہ کی خواہش کے مطابق خضر نے شہر کے صاف سترے علاقے میں بڑا سا گھر خریدا اور پھر اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگ گیا۔

اور.....

صالیہ اسے جب فراغت نصیب ہوئی تو فطری طور پر اسے وہ گھر یاد آیا۔ جسے وہ چھوڑ آئی تھی۔ ماما جی، پتاجی، راجیش بھیا یہاں تک کہ رام کا کا کا بھی یاد آئے، اور وہ سوچنے لگی کہ اس کی گمشدگی کو سب نے کیا نام دیا ہوگا۔ اور پتا نہیں کون کون سی کہانیاں سنا کر لوگوں کی۔ زبانیں بندی ہوں گی اور کون جانے لوگوں کی زبانیں بند ہوں گی بھی کہ نہیں۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ کبھی بھی آسودہ نہیں رہتا کسی نہ کسی بات کو لازمی طور پر اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے، اور پھر اس کے لئے جلنا کڑھنا خود اپنے نصیب میں لکھتا ہے۔ وہ بھی جب تک اس زندگی کے حصول کے لئے خضر کے ساتھ جدوجہد میں شامل رہی تب تک اسے چھوڑے ہوئے گھر کا خیال نہیں آیا۔ فقط ایک آسودہ زندگی کا تصور اور اس کے حصول کی کوشش ہی جیسے ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اور جب وہ مقصد پالیا اور کرنے کو کچھ نہیں رہا تو پچھلے گھر کی خلش دل میں سراپا رہنے لگی۔

”میرے بعد کیا ہوا ہوگا.....؟“

”کیسے اور کیونکر.....؟“

”سب پر کیا مبنی ہوگی.....؟“

”اور کیا سارا الزام خضر کے سر رکھا گیا ہوگا.....؟“

ان باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ جب فارغ بیٹھتی یہی سب سوچا کرتی تھی۔

”کاش! میں راجیش بھیا کو اپنی خیریت سے آگاہ کر سکتی۔ اور انہیں یہ بھی بتا سکتی کہ میں یہاں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔“

خضر بہت دنوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے یا تو کھوسی جاتی یا کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتی ہے۔ اس نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا، خیال تھا کہ وہ خود ہی کسی دن اس سے کہہ دے گی۔ لیکن کافی دن گزر گئے، وہ کچھ نہیں بولی جبکہ اس کے انداز اب بھی وہی تھے، اور وہ مزید صبر نہ کر سکا۔ تو پوچھ ہی بیٹھا۔

”کیا سوچا کرتی ہو.....؟“

”کچھ نہیں.....“ اس نے ٹالنا چاہا۔ مبادا وہ کچھ اور سمجھ بیٹھے۔

”نہیں کوئی بات ضرور ہے مجھے بتاؤ۔“ اس کے اصرار پر اس نے اپنے اندر اٹھتے سارے سوال ڈھرا دیئے۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا۔

”تم راجیش کو خط لکھ دو۔“

”میں.....“

”ہاں.....! میں خود اس بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ راجیش میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا کہ میں نے دوستی کی آڑ میں.....“

”تمہارا دوش نہیں ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”تو پھر اس کی نظروں میں مجھے نزدوش ثابت کر دو۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ اس نے ہامی بھری۔

پھر اگلے ہی دن تک وہ خط لکھنے کے بارے میں سوچتی رہی اور یہ کہ کیا لکھے۔ کچھ میں تو کچھ نہیں آیا لیکن جب ایک رات لکھنے بیٹھی تو قلم خود بخود چل پڑا۔

پیارے راجیش بھیا.....!

مجھے یہ خط بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن تاخیر اس لئے ہوئی کہ سوچا جیون کی ناؤ کسی کنارے لگے تب اطمینان سے لکھوں گی اور اب جب اللہ کے فضل سے میں ہر طرف سے مطمئن ہوں تو آپ کو لکھ رہی ہوں، سب سے پہلے تو ماما جی اور پتاجی کے بارے میں پوچھوں گی۔ ان کا کیا حال ہے۔ میری گمشدگی یقیناً آپ کے لئے معمہ ہوگی، اور اگر کوئی خیال آتا ہوگا تو صرف خضر بابو کا، کیونکہ اس رات وہی ہمارے گھر آئے تھے۔ اور یہ بات میرے علاوہ رام کا کو بھی معلوم تھی۔

اس رات حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے راجیش بھیا! کہ مجھے خود خضر بابو کو سب سے چھپا کر وہاں سے نکالنا پڑا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ لوگ ہمارے گھر پر ہی انہیں ختم کر دیتے اور یہ بات تو آپ کو بھی گوارا نہ ہوتی۔

یقین کیجئے بھیا! جب میں خضر بابو کو گاؤں سے نکال کر لے گئی، اس وقت تک میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ لیکن راستے میں جب ان کے تمام گھروالوں کی لاشیں دیکھیں اور خضر بابو کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تو اسی وقت میں نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا دل کسی طرح بھی انہیں تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا، گو کہ خضر بابو مجھے اپنے ساتھ لانے پر آمادہ نہیں تھے، انہوں نے مجھے واپس بھیجنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی، اور اب جب میں خضر کو ایک کامیاب انسان کے روپ میں دیکھ رہی ہوں تو مجھے اپنے فیصلے پر قطعی ندامت نہیں ہے۔ یقیناً وہ میری ہی بدولت اتنی جلدی اس مقام پر آئے ہیں۔ ورنہ تنہائی کے عذاب سے نکلنے کے لئے انہیں ایک عرصہ درکار تھا۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم نے یہاں آتے ہی شادی کر لی تھی، اور اب جبکہ ہماری شادی کو دو سال ہونے کو ہیں، ایک پھول احتشام کی صورت ہمارے آگن میں کھل رہا ہے اور دوسرا.....

آخر میں اتنا لکھوں گی کہ کبھی خضر بابو کا خیال آئے تو ان کی طرف سے دل برا مت کیجئے گا۔ کہ وہ نزدوش ہیں۔ ماتاجی، پتاجی، اور رام کا کا کو سلام کہیے گا۔

فقط آپ کی

صالحہ بیگم (جو کبھی پوجا تھی)

خط بھیجتے ہی وہ انتظار کی صلیب پر لٹک گئی۔ ہر بل اس مخصوص دستک کی منتظر جو اسے راجیش بھیا کی طرف سے کسی سندیے کی نوید دے۔ کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ یہاں تک کہ اس کی گود اور آگن میں احتشام کے بعد حسام کی محسوم کلکاریوں کی مہک اڑ آئی۔ کچھ دن کے لئے وہ سب بھلا کر حسام میں مصروف رہی، پھر دونوں بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے اس قسم کے جملے اس کے منہ سے نکلنے لگے۔

”شام کے ماتاجی کا خط آئے گا۔ وہ میرے شام کے بارے میں پوچھیں گے، اور ڈھیر سارا پیار بھی بھیجیں گے۔ پھر ہم انہیں لکھیں گے کہ شام کا تنہا بھائی حسام آیا ہے۔“ آخر میں سوچتی۔

پتا نہیں راجیش بھیا کا خط کیوں نہیں آیا۔ اور پھر نئے سرے سے انتظار شروع کر دیتی۔ ”خضر! راجیش بھیا نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا.....؟“ اس روز وہ مایوس ہو کر اس سے کہنے لگی۔

”پریشان کیوں ہوتی ہو۔ کسی دن آ جائے گا۔“

”کب..... مجھے لکھے ہوئے ایک مہینہ سے زیادہ ہے۔“

”ہو سکتا ہے ڈاک کا نظام درست نہ ہو۔“ خضر نے بھلایا اور بھلنا اس کی مجبوری تھی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے راجیش کا خط آ گیا۔ اس نے بے تابی سے کھولا۔ بس چند لائنیں جو شاید تھیں گئی تھیں۔

”تم نے جو کیا شاید اچھا ہی کیا۔ لیکن ہمارے لیے پوجا مرگئی اور کسی صالحہ کو نہ ہم جانتے ہیں نہ ہی اس سے رابطہ رکھنا چاہیں گے۔“

ایک بار دو بار وہ بار بار ان چند لائنوں کو پڑھتی گئی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ راجیش بھیا نے ایسا لکھا ہے، وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی اور یہاں تو راجیش نے سارے ناتے ہی توڑ ڈالے تھے۔ اس کے دل میں درد سا ہونے لگا، اور آنکھیں جلنے لگیں۔ سارا دن وہ بے کل رہی اور وقفے وقفے سے دل کا درد آنکھوں کی راہ بہا تتی رہی۔

شام میں خضر آیا تو وہ بہت حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بہت خاموشی سے راجیش کا خط خضر کو تھما دیا۔ اس نے پڑھا اور فوری طور پر اس کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اتنے اعتماد سے کھڑی ہے اس کے دیکھتے ہی ڈھے جائے گی۔

”پوجا مرگئی..... سناتم نے خضر.....! پوجا مر گئی۔“

وہ اسے مخاطب کر کے بلند آواز میں بولی اور ہنستی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آنکھوں سے پانی چھلکنے لگا تھا۔

○ ○ ○

فوری طور پر صالحہ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کی آنکھیں چھلک کر اس کا اندر عیاں کیے دے رہی ہیں۔ پھر جیسے ہی احساس ہوا وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم نادم ہو.....؟“ خضر پوچھنے لگا۔

”قطعاً نہیں..... پوجا کو میں نے خود مارا ہے۔ پھر کیوں نادم ہوں گی۔“ وہ فوراً نئے حسام پر

جنگ لگی تھی۔

کہانی تھی ختم ہوئی۔ اس کا جلنا کڑھنا سب ختم ہو گیا۔ ہاں ایک کک سی دل میں ضرور تھی جو وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ اس لئے اس نے اس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

خضر نے بزنس کی ابتدا کی تو یہاں بھی قسمت نے ساتھ دیا۔ اور وہ بہت جلد کاروبار کی دنیا میں اپنے قدم جما نے میں کامیاب ہو گیا۔ کبھی کبھی جب وہ اپنے بارے میں سوچنے بیٹھتا تو اسے حیرت ہوتی۔ وہ اتنا ذمہ دار تو کبھی بھی نہیں تھا۔ شاید وقت اور حالات نے اسے بہت جلد اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ اور وقت ہی نے اسے بے تحاشا مصروف بھی کر دیا تھا۔

○ ○ ○

اماں حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ لیکن حق نواز کے دوبارہ اس اقدام نے ان کے سارے حوصلہ توڑ دیے۔ اب کسی موہوم سی امید کا سہارا بھی نہیں رہا تھا۔ مہر النساء کو دیکھتیں اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں۔

وہ آج کل ایسی حالت میں تھی کہ اسے محبت اور توجہ کی ضرورت تھی۔ نواز سے تو امید نہیں تھی۔ وہ خود ہی اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے اندر کہیں شاید یہ خیال بھی تھا کہ انہوں نے ایک بے سہارا لڑکی پر ظلم کیا ہے۔ گو کہ انہوں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن غیر دانستہ جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ مہر النساء کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔ اور نہ کبھی اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ اور شاید اس کی خاموشی ہی انہیں مارے ڈال رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ احتجاج کرتی یا انہیں الزام دیتی تو انہیں اتنا احساس نہ ہوتا۔ لیکن یہاں تو ہر بات کے جواب میں ایک مسلسل چپ تھی۔

”مہر! کچھ تو کہو بیٹی!.....“ اماں نے اس سے التجا کر ڈالی۔

”کیا کہوں!.....“ وہ الٹا انہی سے پوچھنے لگی۔

”مجھے الزام ہی دے ڈالو۔“

”نہیں اماں!.....“ وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ ”آپ نے کیا کیا ہے جو میں آپ کو الزام دوں۔ اور پھر آپ خود کون سی سکھی ہیں۔ پہلے تو صرف بیٹے کے لئے کڑھتی تھیں۔ اب میں بھی آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔“

”تم بوجھ نہیں ہو۔“

”بوجھ ہی تو ہوں، اور کچھ دن بعد ایک اور وجود۔“ اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ اور آواز ساتھ چھوڑ گئی۔

”ایسا مت کہو بیٹی۔ ہو سکتا ہے آنے والا وجود اس گھر کے لئے مبارک ثابت ہو۔ اللہ سے اچھی امید رکھو اور خیر کی دعا کرو۔“

اماں نے مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے سے پہلے ایک اور امید کا دامن تھام لیا۔

”شاید کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے۔“

”نواز نے میرا اور مہر کا خیال نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے بچے کی خاطر اپنی ڈگر چھوڑ دے۔“

”ہو سکتا ہے آزمائشیں یہیں تک ہوں۔“

اور آخر میں دعا.....

”کوئی گناہ، کوئی خطا جس پر تیری گرفت ہو مالک!..... وہ سب بخش دے۔ مجھ دیکھواری پر رحم کر اور ان آزمائشوں سے نکال مجھے۔“

اور اُپر والے نے انہیں آزمائشوں سے ہی نہیں دنیاوی جھیلیوں سے بھی نکال لیا۔

وہ جو کبھی حوصلہ نہیں ہارتی تھیں۔ ایک کے بعد ایک ہمیشہ امید کا دامن تھامے رکھا۔ اپنی آخری امید دیکھنے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ مہر کے لئے یہ ایک سانحہ تھا۔ وہ اچانک اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ سر پر سائبان تو تھا لیکن وہ زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھنے کا اہل نہیں تھا۔ اب بھی پچھلے دودن سے وہ جانے کہاں کہاں غائب تھا۔ اماں کی تدفین سے سوئم تک سارا کام محلے والوں نے کیا۔ وہ اس کی راہ دیکھتی رہی تھی کہ کم از کم اس ماں کو کاغذ دینے تو آ جائے جس نے ساری عمر اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا تھا۔ لیکن شاید بد قسمت تھا وہ یا پھر اماں ہی خوش نصیب تھیں جو آخری وقت بھی اپنا بوجھ اس کے کاندھوں پر نہیں ڈالا۔

تین دن تک محلے کی عورتوں نے اس کی تنہائیوں کو بانٹا اور چوتھے دن اللہ میاں نے اس کی گود میں دو جڑواں بچے ایک ساتھ ڈال دیے۔ وہ حیران ہو کر باری باری دونوں کو دیکھنے لگی اور سوچا۔

پتا نہیں، یہ قدرت کی طرف سے انعام ہے یا آزمائشوں کا کوئی نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اسی شام نواز آیا۔ حسب معمول اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسی حالت میں وہ کوئی بات نہیں سمجھتا۔ وہ دوسرے سے کچھ سننا ہی نہیں چاہتا۔ اس کے باوجود وہ پکار کر کہنے لگی۔

”کہاں تھے اتنے دن سے؟“

”کہیں نہیں۔“ وہ چاہتا تھا چار پائی پر گر کر سوراہے اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولی۔
”تمہیں پتا ہے، تمہارے پیچھے یہاں کیا کچھ ہو گیا ہے۔“
”نہیں۔۔۔۔۔“

”اماں مر گئیں۔“ وہ ایک دم سے کہہ گئی۔

”اچھا۔۔۔۔۔!“ وہ شاید سمجھا نہیں تھا، اور جب سمجھا تو کتنی دیر تک گم صم کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چار پائی پر ڈھس گیا۔ وہ خود اٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ وہیں سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سیدھا لینا چھت کو گھور رہا تھا۔

”سنو نواز۔۔۔۔۔!“ اس نے مخاطب کیا تو وہ بھی وہیں سے گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

”یہ بچہ۔۔۔۔۔!“ اس نے اپنے برابر لیٹے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کس کے ہیں۔۔۔۔۔؟“ بے خیالی میں بولا۔

”ہمارے ہیں۔۔۔۔۔“

”دونوں۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔!“

”لڑکے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”ایک بیٹا۔۔۔۔۔ ایک بیٹی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔!“ بس ذرا دیر کو بچوں کو دیکھا پھر جا کر لیٹ گیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد غافل بھی ہو گیا تھا۔

پھر اگلے چند دن تک وہ محلے کی خواتین کے رحم و کرم پر رہی۔ کوئی آکر کھانا دے جاتی تو کوئی بچوں کو صاف ستھرا کر جاتی۔ جس دن وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی۔ سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ چند دن جو انہوں نے خیال رکھا تھا۔ یہی بہت تھا۔ ورنہ وہ کیا کر لیتی۔

اس دن وہ بہت پریشان تھی۔ گھر میں جو کچھ موجود تھا، وہ صبح ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے نواز سے کہا تو وہ یہ کہہ کر نکلا کہ میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔ اور اب دوپہر کے بعد شام ہونے کو آئی تھی اور وہ نہیں آیا تھا۔ صبح تا شام برائے نام ہی کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک بھوکہ تھی اور بچوں کو دودھ پلا کر تو وہ بالکل ہی غمناک ہو چکی تھی۔

”کیا کروں۔۔۔۔۔؟“ وہ بار بار اپنے اجازت ویران باورچی خانے کی طرف دیکھتی اور سوچتی کہ اٹھ کر جائے اور دیکھے شاید کوئی چیز مل جائے، لیکن وہاں تک جانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ادھر متوجہ ہو گئی۔ دستک کے بعد ایک خاتون اندر چلی آ رہی

تھی۔ وہ بغور دیکھنے لگی اور پھر اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔
”صالحہ۔۔۔۔۔!“

”مہرو۔۔۔۔۔! یہ تم ہی ہوناں۔۔۔۔۔؟“ صالحہ اس کے قریب آ کر پوچھنے لگی۔ اس نے اثبات

میں سر ہلا دیا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔ اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔“ وہ کیا کہتی خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”اماں کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“ صالحہ نے پوچھا تو اس کی آنکھیں جو تھلکنے کو بے تاب تھیں، اسی

بہانے جھلک پڑیں۔

”ارے۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“ صالحہ اس کے رونے سے پریشان ہوئی اور اس کے پاس آ

بیٹھی۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے اماں کے انتقال کا

بتایا۔

”مجھے اطلاع ہی نہیں دی کسی نے۔“ صالحہ کو دکھ ہوا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”میں کیا کرتی۔۔۔۔۔ میری اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔“ اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا تو

صالحہ پہلی بار ادھر متوجہ ہوئی۔

”ارے جڑوں ہیں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔!“

”اماں کے انتقال سے پہلے ہوئے یا بعد میں۔“ وہ پوچھنے لگی۔

”بعد میں۔۔۔۔۔“

”بیچاری اماں۔۔۔۔۔ کم از کم بچوں کو تو دیکھ جاتیں۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”نواز کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ صالحہ کچھ دیر تک خاموشی سے اس کی طرف

دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

”سنو۔۔۔۔۔! نواز کے بارے میں ادھر ادھر سے خبریں ملتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ وہ دوبارہ۔“

”ہاں۔۔۔۔۔!“ اس نے اعتراف کیا اور پھر رونے لگی صالحہ نے بمشکل اسے چپ کرایا۔ پھر

اس کے لئے پانی لینے کچن میں چلی گئی۔ اور کچن کی حالت دیکھ کر ہی وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔ واپس آ کر

اسے پانی پلایا پھر پوچھنے لگی۔

”تم نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔“

”نواز لینے گیا ہے۔“ اس نے اپنے گھر کی لاج رکھنی چاہی، حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ نواز

کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر چکی تھی۔

”ظہر و.....! میں ڈرائیور سے کچھ منگواتی ہوں۔“ صالحہ اٹھنے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں صالحہ.....! نواز بس ابھی آتا ہی ہوگا۔“

”اس کا انتظار فضول ہے..... اور یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“

صالحہ ہاتھ چمڑا کر چلی گئی۔ پھر ڈرائیور سے بات کر کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اس کے پاس آئی۔

”میں نے اور سمجھانے کے انداز میں کہنے لگی۔“

”سنو مہر و.....! میں تمہیں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ نواز کو چھوڑ دو، کیونکہ عورت کا گھر ایک ہی بار بستا ہے۔ وہ خواہ کیسا بھی ہے، تمہارا شوہر ہے۔ اور تمہیں اس گھر میں رہنا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ تم نے اسے سدھارنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ تم نے یقیناً اپنی سی ہر کوشش کر دیکھی ہوگی۔ اور اب جب وہ نہیں سدھرتا تو تم ہی کچھ کرو۔ کیوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر محض اس کی راہ نکلتے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ جب کہ یہ دو بچے بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اور تمہاری ذمہ داری ہیں۔ تم انہیں بے آسرا یا حالات کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتیں ناں.....!“

”نہیں..... انہی کے لئے تو میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔“

”تو پھر حوصلے سے زندہ رہو۔ اماں کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ ایک حق نواز کی خاطر انہوں نے ساری زندگی اس آس میں گزار دی کہ کبھی تو وہ ان کے دلدر سیٹھے گا۔ اور یہ اماں کی بد نصیبی نہیں ہے مہر و کہ نواز نے ان کے دکھ نہیں سمیٹے، عورت تو پیدا ہی مر مٹنے کے لئے ہوتی ہے۔ کبھی ماں باپ کے لئے کبھی گھر کے لئے کبھی شوہر اور کبھی اولاد کے لیے۔ مر مٹتا بہر حال نصیب میں لکھا گیا ہے۔ ہاں بد نصیبی ہے نواز کی جس کا دامن ایک عظیم ماں کے دکھ سیٹھنے سے محروم رہ گیا۔ اور یقیناً رکھنا مہر و بقیہ تمام زندگی اس کے دامن میں کچھ نہیں سما سکے گا۔“

مہر و بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھے گئی تو وہ پوچھنے لگی۔

”تمہیں سلامتی آتی ہے.....؟“

”ہاں.....!“ اس نے زبان کے ساتھ سر بھی ہلایا۔

”تو اب اماں کی جگہ تم سنبھال لو۔“ اس نے مشورہ دیا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھو، اماں تو ماتا کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ تم بھی اپنی محنت کی کمائی نواز کو مت دینا۔ اور لو، یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ کبھی ضرورت پڑے تو میرے پاس آ جانا یا مجھے بلا لینا۔ ویسے تو میں آتی رہوں گی۔ لیکن کیونکہ میری مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے میں احتیاطاً تم سے کہہ رہی ہوں کہ اگر کبھی میں نہ آ سکوں اور

تمہیں ضرورت ہو تو۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید ڈرائیور آ گیا تھا۔ صالحہ اٹھ کر چلی گئی۔ واپس آئی تو ڈرائیور اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جو دونوں ہاتھوں میں تھیلے اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ساری چیزیں پکٹن میں رکھوائیں پھر اسے باہر جانے کا کہا اور خود ایک تھیلی اور دو پلٹیں لے کر اس کے آئینگی۔

”آؤ..... پہلے کھانا کھالیں۔“

”صالحہ.....! یہ سب.....“ وہ خاصی شرمندہ ہو رہی تھی۔ ”میں کوئی غیر نہیں ہوں مہر و۔ اس گھر اور اماں کے ناتے ہم دونوں ایک خاص بندھن میں بندھے ہیں..... لو کھاؤ۔“

اس نے خود ہی نوالہ بنا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اور پہلا نوالہ منہ میں کیا گیا کہ وہ کھاتی چلی گئی۔

”چائے بنا لاؤں صالحہ.....؟“

”نہیں چائے رہنے دو میں پھر کسی وقت آ کر پی لوں گی۔ اس وقت بہت دیر ہو گئی ہے۔“

صالحہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر بچوں کے پاس آ کر کہنے لگی۔ ”انہیں تو میں نے ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں۔ کیا نام رکھا ہے دونوں کا۔“

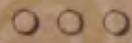
”رابعہ اور فراس.....“

”ماشاء اللہ..... بہت پیارے نام ہیں۔“ صالحہ نے کہا اور پرس میں سے کچھ روپے نکال کر رابعہ کی چھوٹی سی مٹھی میں بند کرنے لگی۔

”یہ مت کرو صالحہ.....! تم نے پہلے ہی۔“

”میں تمہیں تو نہیں دے رہی۔“ اس نے پیار سے ڈانٹا اور پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

رات جب وہ فراغت میٹھی تو اس نے خضر کو اماں کے انتقال کا بتایا۔ اور مہر و کا ذکر کر کے دیر تک اس کی حالت پر افسوس کرتی رہی تھی۔



وقت کا پھیپہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ صالحہ بیگم ابتدائی سات سالوں میں پانچ بچوں کو جنم دے کر اپنے گھر کو مکمل کر گئی۔ احتشام، حسام، نائلہ، انعام اور صبیحہ۔ یہ سب اس کی کائنات تھے۔ اور وہ اپنی کائنات کو سجانے سنوارنے میں بھرپور کردار ادا کر رہی تھی۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم میں وہ خود بچوں کے ساتھ شریک تھی کہ جو باتیں نہیں جانتی تھی وہ اب جان رہی تھی۔ دلچسپی بڑھی تو وہ اپنے طور پر بھی، اسلامیات کا مطالعہ کرنے لگی۔ اور پھر وہ جو ہے تاکہ تم

ایک قدم بڑھواؤ پر والدین قدم بڑھ کر تھیں ملے گا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ خدا کو شاید اس کی بھلائی منظور تھی کہ اگلے چند برسوں میں وہ ایک مکمل اور پھر پور عورت کے روپ میں سامنے آئی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تو مسلم ہے جس طرح وہ اللہ اللہ کا ورد کرتی تھی۔ اس سے تو لگتا تھا جیسے وہ ماں کے پیٹ سے یہ نام ساتھ لے کر آئی تھی۔ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی انسان بظاہر ہر لحاظ سے مکمل ہونے کے باوجود کسی ایک پہلو سے ضرور ادھورا رہ جاتا ہے اور یہی خدا اور بندے میں واضح فرق ہے۔ صالحہ بیگم نے بھی گوکہ ہر لحاظ سے اپنی شخصیت کی تکمیل کر دی تھی۔ لیکن ایک پہلو جسے یا تو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ یا اسے خیال نہیں رہا تھا۔ اور وہ پہلو تھا۔ اس کا ہندوانہ رسم و رواج پر سختی سے کاربند رہنا۔ اس سلسلے میں خضر بھی اسے سمجھانے یا جبر کرنے سے معذور تھا۔ کیونکہ عام حالات میں بھی عورت ”کم مانتی“ ہے اور زیادہ منواتی ہے۔“ کے تحت مرد پر اپنی گرفت مضبوط رکھتی ہے۔ اور صالحہ بیگم کا پلڑا تو یہاں بھی بھاری تھا کہ وہ گھریار کے علاوہ اپنا دھرم تک خضر کی خاطر چھوڑ چکی تھی۔ اور پھر جس طرح اس نے اتنے بڑے گھر کو احسن طریقے سے چلانے کے ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی تھی۔ وہ قابل ستائش تھی۔

اور مرد کو کیا چاہیے نیک اور صالح اولاد اور گھر کا سکون، تو یہ سب خضر کو میسر تھا۔ پھر وہ ایک ذرا سی بات کے لئے صالحہ سے کیوں الجھتا۔ اس کے برعکس جہاں وہ اس کا ممنون تھا۔ وہاں بچے بھی اسے بے جی بے جی کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس نے شروع ہی سے بچوں کے ساتھ ایک مخصوص رویہ رکھا تھا کہ وہ بیک وقت اس کے قریب بھی تھے۔ اور دور بھی۔ قریب اس لحاظ سے کہ ذہنی ہم آہنگی اس حد تک تھی کہ وہ اپنی ہر بات ہر ضرورت بڑے اعتماد سے کہہ دیا کرتے اور اپنے مسائل و دستوں کی طرح ڈسکس کرتے تھے اور دوری یوں تھی کہ ایک حد سے آگے کبھی نہ بڑھے تھے۔

وہ بے جا روک ٹوک نہیں کرتی تھی۔ لیکن آزادی بھی ایک حد تک ہی دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ سب بہن بھائیوں کو ایک مضبوط ڈوری میں باندھ رکھا تھا کہ کسی ایک کو تکلیف ہوتی تو دوسرا فوراً محسوس کر لیتا تھا۔

اس شام خضر آفس سے لوٹا تو اسے لان میں بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ موسم بہار کی ابتدائی شاخیں تھیں۔ کلیوں نے کھل کر لان کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ گوکہ تھکا ہوا تھا اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اور بچوں کو لان میں دیکھ کر اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے دیکھا اسنے بچوں کے علاوہ بڑے بچے بھی تھے اور وہ ان کے

کے کھیل میں کافی دلچسپی لے رہی تھی۔

”ہیلو.....!“ اس نے کہا اور پھر اس کے قریب نیچے ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔

”ارے.....!“ اور پٹھوٹاں۔“

”نہیں میں ذرا ریلیکس ہونا چاہتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کہیاں گھاس پر ٹکا کر ٹانگیں سیدھی کر لیں۔

”تھک گئے ہو.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”ہاں.....!“ آج کچھ کام کا پریشز زیادہ تھا۔“

”چائے پیو گے.....؟“

”ہاں.....!“ وہ اٹھنے لگی تو اس نے روک لیا۔

”شام سے کہو، وہ خانہ ماں سے کہہ آئے گا۔“ پھر اس نے خود ہی احتشام کو آواز دے ڈالی۔

”جاؤ..... بیٹا.....! خانہ ماں سے کہو۔ چائے یہاں لے آئے۔“ شام بھاگتا ہوا اندر چلا گیا تو وہ دونوں بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ہراسندر گو بھی بندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

نانکھہ اچانک ابرار کا ہاتھ پکڑ کر سب کے درمیان سے نکلتی ہوئی خضر کے پاس چلی آئی اور کہنے لگی۔

”بابا.....! دیکھئے میں نے ابرار کے ہاتھ پر راکھی باندھی ہے۔“

”کیا.....؟“ وہ چونکا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہاں بابا.....! بے جی کہتی ہیں۔ یہ راکھی باندھنے سے اب ابرار میرا بھائی ہو گیا ہے۔ شام بھائی کی طرح۔“

نانکھہ معصومیت سے بتا رہی تھی اور وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جو دونوں بچوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

”بابا.....! آپ کے ہاتھ پر بھی راکھی باندھ دوں پھر آپ بھی میرے بھائی ہو جائیں گے۔“ وہ چھوٹی سی بچی ایسی ہی باتیں کر سکتی تھی۔

”نہیں بیٹا.....! آپ جا کر کھیلو۔“

”آپ کے ہاتھ پر راکھی باندھ دوں۔“

وہ جاتے جاتے کہہ گئی اور اسے بے اختیار ہنسی آگئی شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میرے ہاتھ پر راکھی باندھو گی.....؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تو اسے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

”صالحہ.....! کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمارے ہاں راکھی کا کوئی تصور نہیں ہے۔“

”جانتی ہوں۔“

”پھر بھی تم نے.....“

”مجھے یہ رسم اچھی لگتی ہے خضر.....! اور میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔“

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”مت چھوڑو لیکن پلیز اسے سنجیدگی سے مت لیتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب سمجھانے سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ ان بچوں کو دیکھو۔ آج یہ چھوٹے ہیں، کل بڑے ہوں گے۔ فرض کرو تانکہ اور ابرار کے درمیان۔ انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو جاتی ہے، اور جب شادی کی بات آئے گی۔“

”یہ قطعی ناممکن ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔

”کیوں.....؟“

”اس لئے کہ تانکہ اس کے ہاتھ پر راکھی باندھ چکی ہے۔“

”اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ اسے سنجیدگی سے مت لو۔ ہمارے مذہب میں اس کی کوئی

اہمیت نہیں ہے۔“

”میں تمہارے مذہب میں پورے خلوص اور نیک نیتی سے شامل ہوئی ہوں خضر! تم پلیز

چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر مجھ پر شبہ مت کرنا۔ میں جانتی ہوں مذہب میں راکھی کا کوئی تصور

اور اہمیت نہیں ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی برائی بھی نہیں ہے۔ جو میں کروں گی۔ اور گرفت میں آ جاؤں

گی۔“

”تم شاید دو کشتیوں میں سوار ہو۔“

”نہیں، تمہاری کشتی میں پاؤں رکھتے ہی میں نے اپنی کشتی کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر اسے

وہ بے ہوش ہوئے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تم گواہ ہو خضر اور گواہ رہنا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اندر کی طرف چل پڑی اور وہ وہیں بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا

رہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ دو متضاد کیفیات میں گھر گیا ہے کہ مطمئن بھی ہے اور الجھتا بھی جا رہا ہے۔

○ ○ ○

شام کا وقت تھا۔ مہر النساء ابھی تک مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ پانچ سالہ رابعہ اور فراز قریب ہی فرش پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ دونوں بچے جب ان کی ماں کام کر رہی ہوتی تو کبھی اسے تنگ نہیں کرتے تھے شاید حالات نے انہیں اتنی سی عمر میں یہ بات سمجھا دی تھی کہ جب تک ان کی امی مشین پر بیٹھی رہیں گی، تب تک ان کے پیٹ کو روٹی ملتی رہے گی، ورنہ مشین بند ہوتے ہی روٹی ملنا بھی بند ہو جائے گی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ فراز نے سرگوشی میں رابعہ سے کہا۔

”چپ کرو، ابھی امی انہیں گی تو روٹی پکا دیں گی۔“ رابعہ آہستہ آواز میں اسے سمجھانے لگی۔

اور وہ جو مشین کی گھر گھر سے نکل کر اب ہاتھ سے کام لگتی تھی بچوں کی سرگوشیوں پر تڑپ اٹھی اور جلدی جلدی سارے بکھرے ہوئے کپڑے سیٹ کر ایک طرف رکھنے لگی۔

”کام ختم ہو گیا امی.....!“ فراز بے تاب سے پوچھنے لگا۔

”نہیں بیٹا.....! پہلے روٹی پکالوں۔ بقیہ کام رات میں کر لوں گی۔“

اس نے کہا اور ابھی اٹھی ہی تھی کہ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور حق نواز اپنے مخصوص انداز میں جھومتا جھامتا اونچی آواز میں گالیاں بکتا ہوا اندر چلا آیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ جبکہ دونوں بچے سہم کر اٹھے اور کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔

”مہرو.....! اے مہرو.....! وہ پکارنے لگا۔ حالانکہ وہ سامنے کھڑی تھی۔

”الوکی پنھی کہاں مر گئی ہے۔“

پھر اس کی زبان سے روانی سے گالیاں نکلنے لگیں۔ وہ تاسف سے دیکھنے لگی۔ جب تک اماں زندہ تھیں۔ وہ کم از کم ایسی زبان تو استعمال نہیں کرتا تھا۔ ان کے ساتھ ہی سارا لحاظ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر سہمے ہوئے بچوں کو دیکھا پھر آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”کیوں چلا رہے ہو.....؟“ وہ آہستہ آواز میں پوچھنے لگی۔

”تو کہاں چلی گئی تھی.....؟“

”کہیں نہیں..... یہیں تمہارے سامنے ہی تو کھڑی تھی۔ تمہیں نظر کیوں نہیں آتا۔“

”اچھا اچھا! سن میں تیرے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔“

”خوشخبری! اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ ایک ٹک اسے دیکھے گی۔“
”ہاں ہے۔ مجھے بہت بڑا کام مل گیا ہے۔۔۔۔۔ ٹھیکے پر۔“ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔ جب کہ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ سمجھنے لیے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے ایسی ہی باتوں میں بہلا کر پھر اپنے اصل مقصد کی طرف آئے گا۔ شروع شروع میں وہ واقعی بہل جایا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ اسے اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اس لیے خاموشی سے کھڑی تھی۔ جب کہ وہ کہہ رہا تھا۔
”اتنے بڑے کام میں ہاتھ تو ڈال دوں لیکن سارا مسئلہ پیسوں کا ہے۔ اگر تھوڑے بہت کا بھی انتظام ہو جائے تو۔“

اس کا دل چاہا کہہ دے پہلے پیسوں کا انتظام کرو پھر کام میں ہاتھ ڈالنا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

”تمہارے پاس کتنے ہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ گھما پھرا کر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں تو خود تمہاری آس پہ بیٹھی ہوں۔“

”جھوٹ کہتی ہے۔ سارا سارا دن جو مشین پر بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے پیسے کہاں جاتے ہیں۔“ وہ طیش میں آنے لگا۔

”تم تو ایسے پوچھ رہے ہو، جیسے گھر کا خرچ تم چلاتے ہو۔“ اس کا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔

”ذلیل کی بچی! زبان کے ساتھ اس نے ہاتھ بھی چلانا شروع کر دیا۔

”نکال جو کچھ ہے تیرے پاس، ورنہ ابھی ختم کر دوں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تو اسے مزید طیش آیا۔ بڑھ کر فرار کو کھینچ لیا۔

”مت دے۔۔۔۔۔ میں اسے ہی گروی رکھ آتا ہوں۔“

”نواز! وہ چیخی اور لپک کر فرار کو اس سے چھیننا چاہا لیکن اس نے فوراً فرار کو اپنے پیچے کر لیا۔

”یوں نہیں پہلے پیسے نکال۔۔۔۔۔ وہ بے بس تھی۔ مجبور ہو گئی، جو کچھ پاس تھا۔ اس کے حوالے کر دیا۔

”مجھ سے چھپاتی ہے۔“ اس نے پیسے مٹی میں دبائے، پھر فرار کو اس کی طرف دھکا دے کر شاطرات مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے جس طرح سے آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

”فرار! اس نے فرار کو ہانڈوں میں بھیپنا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”امی!۔۔۔۔۔!“

رابعہ نے آکر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے کندھے تھام لیے۔ ”ابا چلے گئے ہیں اب آپ نہ روئیں۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگی۔ بچے بیچارے خاصے آرزوہ نظر آ رہے تھے۔ وہ ان کی خاطر فوراً اٹھی، اور منہ ہاتھ دھو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ دونوں بچے اس کے پیچھے آگئے تو اس نے انہیں چوکی پر بٹھایا۔ پھر روٹی ڈالنے لگی۔

”امی!۔۔۔۔۔! ابا یہاں کیوں آتے ہیں۔۔۔۔۔؟“ فرار معصومیت سے پوچھنے لگا۔

”بیٹا!۔۔۔۔۔! یہ ان کا گھر ہے۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔“

وہ سمجھانے لگی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچے اپنے باپ سے متنفر ہو جائیں۔

”مجھے ان کا آنا اچھا نہیں لگتا۔“ رابعہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”جب بھی آتے ہیں، امی کو مارتے

ہیں۔“

”ہاں!۔۔۔۔۔! بہت خراب ہیں مجھے ابا اچھے نہیں لگتے۔“

”بری بات بیٹا!۔۔۔۔۔! ایسے نہیں کہتے“ اس نے ٹوکا اور ان کا دھیان بنانے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ پھر اس نے وہیں بیٹھ کر دونوں کو کھانا کھلایا خود بھی کھایا۔ پھر انہیں اندر جانے کا کہہ کر برتن دھونے لگی۔

بچوں کے سامنے وہ اپنے سارے زخم چھپائے بیٹھی تھی۔ اب تنہائی ملی تو ایک ایک کر کے سب رنے لگے۔

”چنانچہ!۔۔۔۔۔! کیسی ہوتی ہیں وہ لڑکیاں میکے کے نام پر ایک تحفظ، ایک مان، ایک زعم نصیب ہوتا ہے۔ اس نے سوچا اور آنکھوں میں برسات اتر آئی۔ کتنی دیر تک وہ وہیں بیٹھی چپ چاپ روتی رہی پھر غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تو اسے بچوں کا خیال آیا۔ فوراً اٹھ کر اندر آ گئی۔ وہ دونوں بہت خاموشی سے اپنی اپنی تختیاں لکھنے میں مصروف تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کہنے لگی۔

”میں کبھی تم دونوں سو گئے۔“

”کام کر کے سوئیں گے۔“ رابعہ نے جواب دیا۔

”صبح کر لینا بیٹا!۔۔۔۔۔! اب سو جاؤ۔“

”نہیں امی!۔۔۔۔۔! پہلے کام کریں گے۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ میں پڑھ لکھ کر ہی بڑا آدمی بنوں گا۔“

فرار اسی کی بات دہرا رہا تھا۔ وہ گھٹنے فرش پر ٹیک کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”ہاں بیٹا.....! تم نواز کی طرح اپنا دامن خالی مت رہنے دینا۔ میرے سارے دکھ سمیٹ لیتا۔“

فراز پتا نہیں اس کی بات سمجھایا نہیں لیکن پوچھنے لگا۔
”کیسے امی.....؟“

”اچھے انسان بن کر جب تم اچھے اور بڑے آدمی بن جاؤ گے، تو میرے سارے دلدراپ ہی آپ دور ہو جائیں گے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم دل لگا کر پڑھنا اور رابعہ کو بھی پڑھانا۔“

وہ تصور کی آنکھ سے بہت دور تک دیکھنے لگی تھی۔

”امی.....! کیا میں بھی بڑا آدمی بنوں گی.....؟“ رابعہ کی بات پر وہ مسکرائی۔

”تم بڑی آدمی بنو گی۔“ اس نے صبح کی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”چلو اب تم دونوں سو جاؤ۔“

”آپ نہیں سوئیں گی.....؟“

”میں بھی سو رہی ہوں۔“ اس نے چار پائیوں پر بستر ٹھیک کیے ایک پرانے دونوں کو لٹایا پھر خود بھی لیٹ گئی۔

وقت کا کام گزرتا ہے۔ جنہیں سب میسر ہوتا ہے۔ انہیں وقت بھاگتا ہوا لگتا ہے۔ اور محرومیوں کا شکار ہونے والوں کے لئے یہی وقت ریگستا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مہرو کے لئے وقت اگر ریگ رہا تھا تو وہ گزر رہا تھا۔ موسم آتے اور اپنی شدتیں اس کے لیے چھوڑتے ہوئے چلے جاتے۔ وہ بہت زیادہ با حوصلہ نہیں تھی۔ پھر بھی موسموں کی شدتیں تنہا اپنی ذات پر سہہ رہی تھیں۔ بچوں کو بہر حال وہ محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ آنے والے وقت سے بہت زیادہ پر امید نہیں تھی۔ نواز کی دن بدن بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور ہر دوسرے دن پیسوں کے مطالبے کے ساتھ آتا۔ گالم گلوچ اور مار پیٹ نے ہی اسے مایوس کیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی۔ یہ اماں کا ہی حوصلہ تھا جو وہ آخری وقت تک پر امید رہیں۔

”شاید کوئی معجزہ ہو جائے یا اللہ میاں کو مجھ پر رحم آجائے۔“ دل آس دلانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اسے معجزے کا یقین نہیں تھا۔ البتہ بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ تھوڑی پر امید ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن یہاں اسے ایک اور وہم پریشان کرتا۔ پتا نہیں وہ اس وقت تک اپنی زندگی کو کھینچ بھی سکے گی یا نہیں۔

اور یہ وہم اس کی گرتی ہوئی صحت نے اسے بخشتا تھا۔ بظاہر اتنی کمزور نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن

اندر سے وہ بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اور اپنے کھوکھلے پن کو صرف وہ خود ہی محسوس کر سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ ریت کی ایسی بوسیدہ دیوار کی مانند ہو چکی ہے۔ جو ذرا سی تیز ہوا سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔

اسی طرح حالات کی چکی میں پتے پتے دو سال اور گزر گئے۔ وہ چاہتی تھی کسی طرح وقت کو پر لگا کر بچوں کو جوانی کی دہلیز پر لاکھڑا کرے۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ابھی تو بچے صرف تیسری جماعت میں ہی آئے تھے۔ کلام پاک اس نے خود انہیں ختم کروا دیا تھا۔ اس روز حق نواز آیا تو قدرے بہتر حالت میں تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر کہنے لگا۔

”مہرو.....! میں شادی کر رہا ہوں۔“

”کیا.....؟“ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”ہاں.....! مجھے ایک بیوی ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ جب کہ تم تو مشین کے ساتھ رہ کر خود بھی مشین بن گئی ہو۔“

”حق نواز.....!“ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ ”مجھے مشین کس نے بنایا ہے۔ جس مشین سے میں نے نانا جوڑا۔ اس کی بدولت تو اس گھر کی گاڑی چل سکی۔ بلکہ تم بھی اپنا حصہ حق سمجھ کر وصول کرتے رہے۔ جب کہ تم سرے سے حقدار ہی نہ تھے۔“ لیکن وہ خاموش کھڑی اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کچھ کہو گی نہیں۔“

”میں کیا کہوں.....؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کچھ بھی.....“

”صرف اتنا بتا دو، اسے کھلاؤ گے کہاں سے۔“

”ارے.....! وہ زور سے ہنس پڑا۔“ کھلانے والا اللہ ہے۔ اور پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہے۔ دو مکان ہیں اس کے پاس..... ہیں تو چھوٹے، لیکن پھر بھی گزارے کے لیے کافی ہیں۔ ایک میں رہیں گے..... دوسرے کا کرایہ کھائیں گے۔“

”تو یوں کہو، اس کے مکانوں سے شادی کر رہے ہو۔“ خلاف توقع وہ اس کی بات پر ہنستا رہا۔

”کیا وہ تم سے شادی پر رضامند ہے.....؟“ وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

”کیوں مجھ میں کیا کمی ہے.....؟“

”کی تو کوئی نہیں..... میں بس یونہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ دل پر جبر کر کے بولی۔
 ”ہاں.....! وہ رضامند ہے۔ بلکہ اس نے خود ہی شادی کی پیشکش کی ہے۔ اصل میں وہ
 بیوہ ہے۔ ایک لڑکا بھی ہے، جو میرا خیال ہے، تمہارے بچوں سے کچھ بڑا ہے۔“
 ”تمہارے بچوں سے.....“ اسے شدید جھٹکا لگا۔ تو کیا یہ صرف میرے بچے ہیں۔ اس کا
 کوئی حق نہیں۔ وہ اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہنے لگا۔

”کیونکہ خاصی قبول صورت عورت ہے اور ایک طرح سے صاحب جائیداد بھی۔ اس لئے
 اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتی۔ دوسرے بچے کی طرف سے بھی خاصی پریشان ہے کہ سر پر باپ
 نہیں ہے تو کہیں غلط راستے پر نہ چل نکلے۔ میں نے سوچا یتیم بچہ ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ دوں گا۔ تو
 ثواب ہی ملے گا۔“

”میرے خدا.....!“ نہ آسمان گرا تھا۔ نہ زمین زلزلوں کی زد میں آئی تھی، پھر کیوں اسے ہر
 چیز گردش کرتی نظر آ رہی تھی۔ اور پھر آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی اور دھند لکڑوں کے اس
 قاروہ شاید جارہا تھا۔

”امی.....! امی.....!“ رابعہ، فراز اس کے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے ”چلے گئے، امی
 ابا چلے گئے۔“ وہ دونوں اس کے ہاتھ ہلاتے ہوئے بتانے لگے۔
 ”اچھا.....!“ وہ طویل سانس لیتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ جب کہ دل یہ چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر
 ساری دنیا کو اٹھا کر لے اور کہے۔

”آؤ دیکھو..... مجھ حرام نصیب کا تماشا.....!“
 ”میں نواز کی ذمہ داریاں اپنے کانڈھوں پر اٹھانے کی سزاوار ہوں، جیسی تو وہ میرے سر
 مشین بننے کا الزام رکھ رہا ہے۔“

”اور.....“
 ”دیکھو.....! اسے جو اپنے فرائض سے غافل ہو کر بھی سرخرو جا رہا ہے۔“
 ”اپنے بچوں کے سر سے دست شفقت کھینچ کر دوسرے کی یتیمی کا ورد لیے جا رہا ہے۔“
 ”خود اس کے بچے جو باپ کے ہوتے یتیم ہو رہے ہیں، انہیں اس یتیمی کے احساس سے
 کون ٹکا لے گا۔“

”کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے۔“
 ”کوئی نہیں ہے۔“ وہ ہلکے ہلکے بڑبڑانے لگی تھی۔ رابعہ نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ دونوں
 ہاتھوں سے تھام لیا۔

”امی.....! ابا نے تو آپ کو نہیں مارا پھر کیوں رو رہی ہیں۔“ رابعہ کے پوچھنے پر اسے
 احساس ہوا کہ اس کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے ہیں۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر رابعہ کی
 طرف دیکھا۔ پھر دونوں بچوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔
 ”ٹھیک کہہ گیا ہے، وہ کہ تم میرے بچے ہو۔“
 ”ہاں.....! تم صرف میرے بچے ہو۔“ اس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا۔ تو وہ
 سختی سے ہونٹ سمیٹ گئی۔

رابعہ اور فراز کی خاطر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اور انہی کی خاطر اس نے اپنے آپ کو سنبھالے
 رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن شاید چوٹ شدید تھی، جس نے اسے چور چور کر دیا تھا کہ ساری
 کوششیں۔ ناکام ہو گئیں اور وہ چار پائی سے لگ گئی۔

حق نواز اس دن کے بعد سے نہیں آیا تھا۔ شاید وہ اپنی نئی دنیا بسا کر اس میں مگن ہو گیا تھا۔
 اب اس مقام پر اسے نواز کا خیال نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ دکھ کہ وہ اسے بچ منجھدار میں چھوڑ گیا تھا۔
 اب تو صرف یہ وہم پریشان کرتا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کے بعد بچوں کو کون دیکھے گا۔

”اس بھری پری دنیا میں کون ہے ایسا.....؟“ اس نے سوچا اور اسے صالحہ کا خیال آیا۔ لیکن
 وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس کے پاس جا کر اپنے بچوں کے لیے امان مانگتی۔ اس نے سوچا وہ صبح
 عرفان کو بلوا کر اسے صالحہ کے گھر کا ہتادے کر بھیجے گی کہ اسے بلالائے۔

رات اس کے لیے بہت بھاری تھی۔ سینے کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔
 ”میرے خدا.....! کچھ وقت اور کہ میں بچوں کا کوئی ٹھکانا کر سکوں۔“
 وہ مسلسل اوپر والے سے مہلت مانگتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اس نے فراز کو آواز دی تو
 اس کے ساتھ رابعہ بھی اٹھ بیٹھ۔

”جاؤ بیٹا.....! تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو۔“
 ”امی.....! آپ کا بخار نہیں اُترا.....؟“ رابعہ پوچھنے لگی۔
 ”نہیں.....“

”پھر آپ لیٹی رہیں۔ میں چائے بھی بنالوں گی۔“
 ”خیال سے بنانا بیٹی.....! اور چولہا بھی خیال سے جلانا۔“

پھر اس نے بچے کے نیچے سے دور پے نکال کر فراز کو دیے کہ جا کر پاپے لے آئے۔ دونوں
 بچے اٹھ کر چلے گئے تو وہ جورات بھری جاگی ہوئی تھی۔ اسے نیند آنے لگی۔ اور پھر شاید وہ سو بھی گئی
 تھی کہ رابعہ نے آکر اٹھایا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کی امی رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سو

نکس تو وہ کبھی نہ اٹھاتی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی۔

”ای۔۔۔۔۔! آپ بھی ہمارے ساتھ پاپے کھالیں۔“

”نہیں بیٹا میرا دل نہیں چاہ رہا۔ ہاں ایک پیالی چائے دے دو۔“ وہ نیکی کے سہارے ذرا سا اونچی ہو بیٹھی۔ راجہ نے چائے لا کر دی تو وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ پھر جب بچے ناشتے سے فارغ ہو گئے تب وہ فراز سے کہنے لگی۔

”جاؤ بیٹا۔۔۔۔۔! عرفان چاچا کو بلا کر لے آؤ۔“

”کیوں ای۔۔۔۔۔!“

”مجھے ان سے کام ہے۔ جاؤ جلدی کرو شاپاش۔“

فراز مزید کوئی سوال کیے بغیر عرفان کو بلانے چلا گیا۔ جب کہ راجہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ وہ چھوٹی سی لڑکی، اسے بس اتنا احساس تھا کہ اس کی امی بیمار ہیں۔ اور وہ ان کی دلجوئی کی خاطر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ بظاہر دلچسپی سے راجہ کو سن رہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان فراز کی طرف تھا کہ کب وہ عرفان کو لے کر آتا ہے۔

فراز کو اکیلے آسے دیکھ کر ہی مہر و سمجھ گئی تھی کہ عرفان نہیں ملا ہوگا۔ اس کے باوجود پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بیٹا عرفان۔۔۔۔۔! چاچا نہیں آئے۔۔۔۔۔؟“

”وہ نہیں ہیں۔“

”تم نے انہیں کہاں دیکھا۔۔۔۔۔؟“

”میں ان کے گھر گیا تھا امی! ان کے بیٹے نے بتایا ہے۔ وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔“

فراز نے بتایا تو وہ بے تاب سے پوچھنے لگی۔

”کب آئیں گے کراچی سے۔۔۔۔۔؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“

”تم نے پوچھا نہیں تھا۔۔۔۔۔؟“ فراز نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے مایوس ہو کر سر نیکی پر مٹھ دیا۔

”اب کیا کروں اور کس سے کہوں۔“

وہ سوچنے لگی۔ لیکن کوئی بھی نام اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ ویسے بھی وہ صرف عرفان سے واقف تھی جب سے اس گھر میں آئی تھی اس نے صرف عرفان ہی کو کبھی کبھار آتے دیکھا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب تک اماں رہیں۔ اماں کے بعد تو وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اور وہ خود کبھی اس گھر کی چار دیواری سے نکلی نہیں تھی۔ اگر وہ بہتر حالت میں ہوتی تو خود ہی بچوں کو لے کر صالحہ کی تلاش میں نکل

کھڑی ہوتی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔

”مجھے ذرا امت سے کام لینا چاہیے ورنہ بچے۔۔۔۔۔“

اور بچوں کا خیال کر کے ہی وہ اٹھی۔ چار پائی سے اتاری تو سر میں بڑی زور کا چکر آیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی اور ابھی اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا ہی چاہتی تھی کہ صالحہ آ گئی۔ شاید خدا کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ ویسے بھی جب بندہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ کوئی معجزہ دکھا کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اور یہ معجزہ ہی تو تھا کہ اس کی بے آواز صدائیں صالحہ کو کھینچ لائی تھیں۔ وہ صالحہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

”مہرو۔۔۔۔۔! اس طرح مت روؤ۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔! بچے پریشان ہو رہے ہیں۔“ صالحہ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھکتی رہی۔ اسے سنہلنے میں کافی دیر لگی۔ شاید دل کا سارا درد اور غبار آنکھوں کی راہ بہا کر ہی وہ سنہل پائی تھی۔

”مجھے بتاؤ کیا بات ہو گئی ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ آرام سے بیٹھی تو صالحہ پوچھنے لگی اور فوری طور پر وہ کچھ بول نہ سکی۔

”یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ کوئی پریشانی کی بات تھی۔ تو مجھے بلو لیتیں۔“

”میں تمہیں بلوانا چاہتی تھی صالحہ۔۔۔۔۔! لیکن کوئی ایسا بندہ نہیں تھا جسے تمہارے پاس بھیجتی۔“

”چلو۔۔۔۔۔ اب تو میں آ گئی ہوں اب بتاؤ کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟ صالحہ نے محبت سے پوچھا تو پہلے اس نے نوازی کی دوسری شادی کے بارے میں بتایا۔ پھر اپنے وہم کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے۔ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکوں گی کیونکہ میرے سینے کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے اور یہ درد میری جان لے کر ہی رہے گا۔“

”ایسا نہ کہو مہرو۔۔۔۔۔! تمہیں ابھی بچوں کی خاطر زندہ رہنا ہے۔“ صالحہ نے حوصلہ دینا چاہا۔

”انہی بچوں کی خاطر تو میں تمہیں بلانا چاہتی تھی۔ میرے بعد کوئی نہیں ہے جو ان کے سر پر ہاتھ رکھے ایک تم ہی ہو جو۔۔۔۔۔“

”مایوسی کی باتیں مت کرو۔“ صالحہ نے ٹوک دیا۔ ”چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“

”نہیں صالحہ۔۔۔۔۔!“

”کیسے نہیں..... چلو اٹھو۔“ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود صالحہ نے زبردستی اسے اٹھایا اور پھر بچوں کو بھی ساتھ لیا اور گاڑی میں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ صالحہ کے کہنے پر ڈاکٹر نے اس کا مکمل چیک اپ کیا۔ پھر آکر اس سے پوچھنے لگا۔

”نیگم حیات.....! یہ خاتون آپ کی کون ہیں؟“

”اسے میری بہن ہی سمجھئے ڈاکٹر صاحب.....!“ ڈاکٹر کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔

”کیوں کیا ہوا.....؟“ وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”یہ عورت اندر سے بالکل جاہ ہو چکی ہے۔ گردے، پیچھے پڑے، بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں اب تو دل۔“

”پلیز ڈاکٹر.....!“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”اسے ابھی زندہ رہنا چاہیے، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”میں میڈیسن لکھ دیتا ہوں۔ پابندی سے استعمال کرائیں۔ اور ہاں انہیں آرام کی بہت سخت ضرورت ہے۔“

”آرام اس کے نصیب میں کہاں۔“ وہ بلا ارادہ ہی کہہ گئی۔

”آرام نہیں کریں گی تو کوئی دوا اثر نہیں کرے گی۔“

ڈاکٹر نے نسخہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر واپسی میں وہ دوائیں اور کچھ پھل وغیرہ لیتی ہوئی آئی تھی۔ گھر میں آتے ہی اس نے مہر کو کولٹا دیا۔ اور تاکید کرنے لگی۔

”دیکھو.....! دوا وقت پر لیتا۔ اور اب تمہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنا ہو سکے آرام کرو۔ لاپرواہی کرو گی تو اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اور نقصان کیا ہے تم تو چپ چاپ مر جاؤ گی۔ پیچھے تمہارے بچے رول جائیں گے۔“

آخر میں وہ اس کی شرگ پر ہاتھ رکھ گئی تھی۔

”میں لاپرواہی نہیں کروں گی صالحہ! لیکن یہ تو سوچو اگر کام نہیں کروں گی تو.....“

”کون سا کام.....؟“ صالحہ اس کی بات کاٹ کر پوچھنے لگی۔

”مشین کا.....“

”خبردار جب تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتیں۔ مشین پر بیٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ اور جسیں گھر کے خرچ کی فکر ہے ناں وہ میں۔“

”نہیں صالحہ.....!“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”مجھ پر اتنے احسان مت کرو۔“

”میری محبت اور خلوص کو احسان کا نام دے رہی ہو۔“ صالحہ نے شکوہ کیا۔ پھر کہنے لگی۔

”میں تم پر احسان نہیں کر رہی ہوں مہر! بلکہ اس عورت کے احسان عظیم کا بدلہ چکانے کی

کوشش کر رہی ہوں جو پہلے مجھے اور پھر تمہیں اس گھر میں لائی۔ حالانکہ میں زندگی بھر اس کے

احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی خواہ میں کچھ بھی کر لوں۔ ذرا سوچو۔ جب ہم نے اس سرزمین پر قدم رکھا

تو کون تھا ہمارا۔ انہوں نے ہی نہ صرف ہمارے سر پر دست شفقت رکھا بلکہ گھر میں بھی جگہ دی۔

اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“

”سنو.....! تم اگر اماں کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہو تو میرے بعد ان بچوں کے سر پر

ہاتھ رکھ دینا کہ یہ انہی کا خون ہیں۔“

”میں تمہاری تسلی کی خاطر وعدہ کرتی ہوں کہ ایسا ہی کروں گی لیکن خدا کے لیے مایوس مت

ہو اور نہ ہی حوصلہ ہارو۔ بچوں کو جو محبت اور توجہ تم دے سکتی ہو، وہ میں ہزار کوشش کے باوجود بھی نہ

دے سکوں گی۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے تم نے اس بات کا زیادہ اثر لیا ہے کہ نواز نے شادی کر لی۔ اور تم ہی کیا

تمہاری جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو اس بات کو محسوس کرتی۔ وہ خواہ کیسا بھی سببی، یہ اطمینان تو

بہر حال تھا کہ وہ تمہارا ہے۔ اب شراکت کی بات آگئی ہے تو تم حوصلہ چھوڑ بیٹھی ہو۔ میری مانو تو

اس کے برعکس سوچو کہ وہ تمہارے لیے کرتا ہی کیا تھا بلکہ ایک طرح سے بوجھ ہی تھا۔ اس انداز سے

سوچو گی تو بہل جاؤ گی۔ اور پھر تمہیں اس سے زیادہ بچوں کو اہمیت دینی چاہیے۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”شاید نہیں یقیناً.....!“ وہ مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اب چلوں گی..... اور سنو، اپنا خیال رکھنا۔ میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تو میں سنجیدگی

سے ناراض ہو جاؤں گی۔“

”میں تمہیں ناراض نہیں ہونے دوں گی۔“ مہر اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ میں کل پھر آؤں گی۔“

اس نے بچوں کو پیار کیا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی

دیر تک مہر اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

پھر اگلے کئی دن صالحہ باقاعدگی سے اس کے پاس آتی رہی۔ علاج اور آرام نے جہاں اس

کی صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہاں صالہ کی باتوں نے بھی سہارا دیا۔ وہ کافی حد تک پرسکون بھی ہو گئی تھی بلکہ صالہ کے سمجھانے کا اثر یہ ہوا کہ وہ اب نواز کے نہ آنے کو بہتر سمجھتی تھی۔ اور محسوس کر رہی تھی کہ پہلے وہ جو اس خوف میں مبتلا رہتی تھی کہ نواز آئے گا اور جو کچھ اس کے پاس ہے سب چھین کر لے جائے گا۔ اب وہ خوف نہیں رہا تھا اور خوف سے نکل کر ہی اس نے کچھ نئی امیدوں کا دامن تھامنا تھا۔

امیدیں روشن رہیں تو جیسے سہارا مل جاتا ہے۔ لیکن اس نے ابھی امیدوں کے سہارے چلنا شروع کیا ہی تھا کہ ایک دن وہ آگیا۔ اپنی پرانی حالت میں دروازے ہی سے اونچی آواز میں گالیاں دیتا ہوا۔

○ ○ ○

زندگی کا ایک رخ یہ بھی تھا۔ جہاں ہر موسم خوشیوں کا پیغام لے کر آتا تھا۔ نہ کسی چیز کا حصول ناممکن اور نہ کوئی پریشانی حال مطمئن تھا اور مستقبل روشن صالہ بیگم صالہ کو امیدوں کے چراغ جلانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ جلتے ہوئے چراغ خود اس کی جھولی میں آن گرتے تھے۔ پھر وہ مطمئن کیوں نہ ہوتی۔ ہر طرف سے ہی مطمئن تھی۔

شوہر ایسا جس نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ اور کبھی اس کی کسی بات سے اختلاف بھی نہیں کرتا تھا۔

بچے خوبصورت ہونے کے ساتھ ذہن بھی تھے اور اسے یقین تھا کہ بڑے ہونے پر وہ سب اپنے شعبوں میں کامیابی کے ساتھ ایک خاص مقام بنائیں گے۔

اور ایسا گھر جس کا کہ ہر عورت صرف تصور کر سکتی ہے۔ وہ اکثر سوچتی۔ اس نے اگر کچھ کھویا ہے تو اس سے کہیں بڑھ کر پایا بھی ہے۔ اور یہ پانے کا خیال زیادہ زور آور تھا جس نے اس کے دل سے اس کک کو تقریباً مٹا ڈالا تھا۔ جو شادی کے ابتدائی چند سالوں میں..... اس کے دل میں رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے کسی کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ بلکہ اکثر ماتاجی، اور پتاجی اور راجیش بھیا اسے یاد آتے اور ایسے وقت وہ ہمیشہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر بہلایا کرتی کہ شادی کے بعد تو لڑکی کو بائبل کا آگمن چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی چھوڑ آئی بہر حال اس نے کسی کی یاد کو جی کاروگ نہیں بنایا تھا۔ اس لیے مطمئن ہی تھی۔ لیکن اس کی مطمئن اور پرسکون زندگی میں اس دن ارتعاش پیدا ہوا جس دن اسے رام کا کا کا خط ملا انہوں نے لکھا تھا۔

”پوچھا بہن..... تمہاری ماتاجی بہت بیمار ہیں۔ گو کہ وہ ظاہر نہیں کرتیں۔ لیکن میں جانتا

ہوں کہ انہیں اندر ہی اندر تمہارا دکھ چالے جا رہا ہے۔ اگر ہو سکے تو آ کر انہیں اپنے شانت ہونے کا دواں دلا جاؤ کیونکہ انہیں دواں نہیں ہے کہ تم شانت ہوگی۔“

میں کیسے آپ کو یقین دلاؤں ماتاجی کہ میں بہت سکون سے ہوں۔ اس نے خط سائینڈ نیبل کی دراز میں ڈالا اور سوچنے لگی۔ ماتاجی کی بیماری کا پڑھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی اور ڈسٹرب بھی اس لئے کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی کسی سوچ کو وہ اپنی گرفت میں لے سکی۔ بس اتنا ہوا کہ اس کا ذہن بھٹکتے بھٹکتے کہیں پیچھے سفر کر گیا تھا۔ اور ذہن بھٹکانے میں اس نام کو بڑا دخل تھا جس سے برسوں بعد کسی نے مخاطب کیا تھا۔ اور جسے وہ برسوں پہلے اپنی گزشتہ زندگی اور یادوں کے ساتھ ہی دفن بھی کر چکی تھی۔

”پوچھا.....! پوچھا.....!“ ہر طرف سے اسے..... ماتاجی پکارتی ہوئی نظر آئیں۔

کبھی اس کے بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی۔

کہیں دودھ کا گلاس لیے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اور کہیں ماتھے پر بندیا جاتی۔

وہ عہد گزشتہ میں گم ہونے جا رہی تھی جہاں ہر طرف پوچھا پوچھا کی صدا کہیں تھیں کہ خضری آواز نے اسے فوراً ہی حال میں لاکھینچا۔

”صالہ.....!“ وہ پکارتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور وہ بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ گئی۔

”کیا بات ہے.....؟“ وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں.....“ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم آج جلدی کیسے آگئے۔“

”کہو تو واپس چلا جاؤں۔“

”ارے نہیں.....! میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ اس کے ہاتھ سے کوٹ کو لے کر بیگر پر لٹکانے لگی تو وہ ایزی چیئر پر بیٹھ کر شوڑا اتارنے لگا۔

”چائے لاؤں.....؟“

”نہیں.....! تم یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔“ وہ کچھ سوچتی ہوئی اس کے سامنے آ بیٹھی تو وہ کہنے لگا۔

”میں پچھلے کئی دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ کیا کوئی ایسی ہی وجہ ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔“

”پچھلے کئی دنوں سے۔“ اس نے قدرے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں.....! اور تم نے تو بتایا نہیں۔ لیکن ڈاکٹر رضی نے بتایا ہے کہ تم اس کے کلینک بھی گئی

”ہاں.....!“ اسے یاد آیا تو کہنے لگی۔ ”اصل میں مہر کی وجہ سے پریشان ہو رہی ہوں۔“
 ”کون مہر.....؟“ فوری طور پر اس کے ذہن میں نہیں آیا تو پوچھنے لگا۔
 ”مہر النساء، حق نواز کی بیوی..... کیا بھول گئے.....؟“

”نہیں بھولا تو نہیں۔ بس ادھر خیال نہیں کیا تھا ہاں کیا ہوا اسے۔“
 ”بے چاری بہت بیمار تھی۔ اور زندگی سے مایوس بھی۔“ پھر وہ اسے تفصیل بتانے لگی۔
 ”اب کیسی ہے.....؟“ جب وہ بتا چکی تو وہ پوچھنے لگا۔

”اب اللہ کا شکر ہے..... بہت بہتر ہے۔“
 ”پھر تم کیوں پریشان ہو.....؟“

”کیا.....؟“ وہ ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں.....!“ جب میں آیا تو تمہیں پریشان ہی دیکھا تھا۔“ اب بتائے بنا چارہ نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی۔

”رام کا کا، کا خط آیا ہے میں اسے پڑھ کر پریشان ہو گئی تھی۔“
 ”کیا لکھا ہے.....؟“

”ماتا جی بیمار ہیں۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ پھر دراز میں سے خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”لو خود ہی پڑھ لو۔“

وہ خط پڑھنے لگا تو وہ چائے لانے کے بہانے کمرے سے نکل گئی۔ گو کہ اس کے جذبات و احساسات بالکل فطری تھے پھر بھی جانے کیوں وہ اس سے چھپانا چاہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ چائے لے کر آئی تو وہ لباس تبدیل کر چکا تھا۔ وہ چائے کا کپ اسے تمبا کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ وہ بھی کچھ دیر تک خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر لا تعلق سی بیٹھی تھی۔ لیکن اس کا ہر انداز بتا رہا تھا جیسے وہ اس کے بولنے کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ زیر لب مسکرایا پھر کہنے لگا۔

”صالح.....! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اگر تم کبھی جانا چاہو گی تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔“ وہ شا کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ تو وہ فوراً وضاحت کرنے لگا۔

”میرا مطلب ہے گھر والوں سے ملنے کے لئے۔“

”کیا مجھے جانا چاہئے.....؟“

”کیوں نہیں..... وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ اور میرا خیال ہے ان کی فحشی میں اب وہ

شدت بھی نہیں رہی ہو گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھ کر جو تھوڑی بہت فحشی رہ گئی ہو گی وہ بھی دور ہو جائے گی۔“
 ”لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کس بات سے.....؟“
 ”پتا نہیں.....“ کچھ دیر رک کر کہنے لگی۔ ”کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟“
 ”میرا خیال ہے۔ فی الحال میرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”پھر.....؟“

”کسی بچے کو لے جاؤ۔“ وہ چپ ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔
 ”پھر میں تمہارے دیزے کی کوشش کروں.....؟“

”ہاں.....! اور میرے ساتھ حمام جائے گا۔“
 ”جسے بھی لے جاؤ۔“ خضر کو اس کی خوشی مطلوب تھی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ جانے کی تیاریوں میں لگی رہی۔ تقریباً بارہ سال کے بعد وہ جاری تھی۔ خوش بھی تھی اور انجانے اندیشوں نے بھی دامن تھام رکھا تھا۔ بہر حال اندیشوں پر سب سے ملنے کی خوشی زیادہ حاوی تھی۔ اس لیے وہ چلی گئی صرف حمام کو لے کر۔

○ ○ ○

حق نواز پھر ہر دوسرے دن آنے لگا تھا۔ اس دوسری عورت نے شاید اپنے آپ کو زمانے کی نظروں سے بچانے کی خاطر اس سے شادی کی تھی۔ ورنہ اسے نواز سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جیسی وہ بے غیرتوں کی طرح اس کے سامنے چلا آتا۔ مانگے سے نہ ملتا تو زبردستی پر اتر آتا تھا۔ مارتا پیٹتا اور آخر میں وہی بچوں کو چھین لے جانے کی دھمکی دیتا اور وہ ہار جاتی۔
 بس احساس نہ مرے۔ احساس مر جائے تو انسان، انسان نہیں رہتا جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ وہ بھی جانوروں سے بدتر نظر آتا تھا۔

اس روز وہ آیا اور یہ حقیقت تھی کہ اس وقت مہر کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے یقین دلاتی رہی کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے تو کیا اپنے گھر کے لئے بھی کچھ نہیں۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنے سارے حربے آزمائے اور وہ کچھ ہوتا تو اس کے حوالے کرتی۔ مار بھی کھائی اور جلے دل کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا۔
 ”لے جاؤ جسے لے جانا چاہتے ہوں۔“

وہ شاید حیران ہوا کیوں کہ جہاں بچوں کی بات آتی تھی وہ ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ لیکن آج اس نے ہتھیار نہیں ڈالے ہتھیار ڈال دیتی تو اس کا مطالبہ کہاں سے پورا کرتی۔

”میں انہیں لے جا کر کیا کروں گا۔“ وہ چیخا۔

”جو دل چاہے کرو۔“ اس نے دل پر پتھر رکھ کر رخ موڑ لیا۔

”مار ڈالوں گا اے۔“ وہ طیش میں آ گیا اور فراز کو کھینچ کر اس کے گلے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ”امی! امی!.....!“ فراز چیخا تو وہ فوراً پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اور اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ وہ نشے میں تھا اور اس سے کوئی بعید نہیں تھا کہ اسے مار ہی ڈالتا۔

”یہ کیا کر رہے ہو..... چھوڑو اسے۔“

وہ اس پر جھپٹی لیکن اس نے اتنی زور سے اس کے پیٹ پر لات ماری کہ وہ تیور کر دیں گر پڑی۔ اس صورت حال سے رابعہ اونچی آواز میں رونے لگی اور فراز اپنا آپ چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔

”کتے کے بچے.....!“

نوازنے کس کے چائے فراز کے منہ پر دے مارا۔ اس غیر متوقع تھپڑ سے فراز کی آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھانے لگا لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھلا اور اس کے ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیے جس سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے کی دیر تھی کہ فراز نے اپنے آپ کو چھڑایا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور وہ جوادہ کھلی آنکھوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہی تھی فراز کو باہر جاتے دیکھ کر آنکھیں بند کر گئی۔

”چھوڑو لگا نہیں۔ ایک ایک کو قتل کر ڈالوں گا۔“ وہ دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ تو رابعہ آ کر اس سے پلٹ گئی۔

”امی!..... امی!.....!“ رابعہ رو رو کر پکارے گئی۔ لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

جس وقت اسے ہوش آیا۔ ہر طرف رات کی سیاہی پھیل چکی تھی اور وہ تنگی زمین پر سیدھی لیٹی تھی۔ رابعہ اس کے سر کے پاس بیٹھی چپ چاپ آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر فوراً اس پر جھک گئی۔

”امی!..... آپ کو کیا ہو گیا ہے.....؟“ اس نے خالی خالی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ پھر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

”تم مت روؤ بیٹی!.....“ اسے چپ کراتے ہوئے وہ خود رو پڑی۔

”امی!..... آپ سو رہی تھیں اور مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔“ رابعہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ تو اسے فراز کا خیال آیا۔ فوراً پوچھنے لگی۔

”فراز کہاں ہے.....؟“

”فراز اس وقت نکلا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔“

”کیا.....؟“ اس کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی اور جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کی پیٹ میں بڑی زور سے درد اٹھا اور وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی دوبارہ کوشش کرنے لگی۔

”بیٹی!..... فراز کو تمہارے ابا تو نہیں لے گئے.....؟“ ایک ہاتھ سے پیٹ کو دبائے وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

”نہیں امی!..... فراز تو پہلے ہی نکل گیا تھا۔“

”پھر کہاں رہ گیا اور ابھی تک آیا کیوں نہیں۔“ وہ جیسے اپنے آپ سے بولی اور قیاس کرنے لگی کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔

”امی!..... میں دیکھوں فراز کو۔“ رابعہ نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کہاں دیکھو گی.....؟“

”باہر نکل کر.....“

”جاؤ پہلے عرفان چاچا کے گھر دیکھو۔ وہاں نہ ہو تو عرفان چاچا سے کہنا وہ فراز کا پتا کریں۔“

اس نے جیسے ہی بات ختم کی رابعہ اٹھ کر چل دی۔ وہ بھی بھائی کی طرف سے خاصی پریشان تھی۔ اور جس زور سے ابا نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ اس کا دل دکھ کر رہ گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ بھائی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے۔ گو کہ اس کے برابر ہی تھی۔ لیکن زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آ جاتے ہیں جب بہنیں چھوٹی ہونے کے باوجود ماں کا کردار ادا کرنے لگتی ہیں اور کبھی بھائی باپ بن جاتے ہیں۔

رابعہ کے جانے کے بعد مہر و کچھ دیرو ہیں لیٹی رہی۔ پھر بمشکل تمام اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی چار پائی تک آئی۔ اس ذرا سی مشقت سے اس کے پیٹ کی تکلیف بڑھ گئی اور سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر رابعہ کو اکیلے واپس آتے دیکھ کر وہ اندیشوں میں گھر گئی۔ باوجود کوشش کے کوئی سوال نہ کر سکی۔ رابعہ خود ہی بتانے لگی۔

”فراز عرفان چاچا کے گھر نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے اسے ڈھونڈ لائیں۔ اور وہ اسے ڈھونڈنے گئے ہیں۔“

”اللہ کرے جلدی آجائے۔“

اس نے کہا۔ پھر اس کی زبان پر دعائیں جاری ہو گئیں۔ وہ جتنا اس کے لیے دعائیں کر رہی

تھی اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ شاید ہر دُعا کے ساتھ کوئی منفی سوچ بھی اس کے دماغ میں آ جاتی تھی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، وہ ہر آہٹ پر چونکتی اور آخر میں اس کی نظریں دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ کہ کسی پل وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوگا۔

”رابعہ.....!“ دستک کے ساتھ عرفان نے باہر ہی پکارا تو اس نے فوراً رابعہ کو جانے کے لیے کہا۔ رابعہ گئی اور پھر واپس آ کر کہنے لگی۔

”عرفان چا چا آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”بیٹا.....! میں چل نہیں سکتی تم انہیں اندر لے آؤ۔ لیکن پھر وہ پہلے مجھے ایک چادر لا کر اوڑھا دو۔“ رابعہ نے کمرے سے ایک چادر لا کر اسے اڑھائی۔ پھر عرفان کو بلالائی۔

”کیا ہوا بھابھی.....! کہاں چلا گیا ہے فراز.....؟“ اور اسے شام کا سارا واقعہ ہرانا پڑا۔

”میرا خیال ہے، نواز باہر ہی سے اسے اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں صبح تک آجائے گا۔“ عرفان نے اسے تسلی دی۔ وہ نواز کا نام سنتے ہی خوفزدہ ہو گئی۔

”تم نہیں جانتے عرفان بھائی! وہ ایک دم وحشی بن چکا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ صبح میں خود جا کر فراز کو لے آؤں گا۔“

پھر وہ تو اپنے طور پر اس کی ڈھارس بندھا کر چلا گیا لیکن وہ سولی پر لٹک گئی تھی۔ ایک پل کو چین نہیں ملا۔ تمام رات دروازے کو تکتے ہوئے گزاری۔

صبح منہ اندھیرے اس نے رابعہ کو اٹھا کر عرفان کے پاس بھیج دیا تھا۔ پھر عرفان نواز کی طرف جانے سے پہلے اس کے پاس ہوتا ہوا گیا تھا اور اس نے بہت زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

واپس آ کر بتایا۔ فراز وہاں نہیں ہے اور نہ ہی نواز اسے لے کر گیا تھا۔ وہ کتنی دیر تک سکتے کی حالت میں بیٹھی عرفان کو دیکھتی رہی۔ رونا چاہا لیکن آنسو آنکھوں میں اتر کے نہ دیے۔ چیخا چاہا تو آواز ساتھ چھوڑ گئی۔

”بھابی.....!“ عرفان اس کی حالت سے پریشان ہو کر پکارنے لگا۔

”امی.....!“ رابعہ جھنجھوڑنے لگی۔ اور پھر وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ چارپائی کی پٹی کے ساتھ سر ٹکراتے لگی۔

”کہاں چلا گیا میرا فراز..... کہاں چلا گیا“ وہ چیخ کر پوچھنے لگی۔ عرفان نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ رابعہ سے پانی منگو کر پلایا۔ کسی حد تک پرسکون ہوئی تو یقین دلایا کہ وہ فراز کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

پھر عرفان چلا گیا تو وہ اپنی ساری تکلیف بھول کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں خود ڈھونڈوں گی اپنے فراز کو۔“ برقعہ اوڑھا اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

وہ کبھی گھر سے نہیں نکلی تھی۔ نہ ضرورت سے اور نہ بلا ضرورت۔ شہر کا ہر راستہ اس کے لیے

انجان تھا۔ پھر بھی وہ مامتا کی ماری عورت ایک ایک گلی کو چہ چھانتی پھری۔ ہر ایک کو روک کر پوچھا۔

”تم نے میرے فراز کو تو نہیں دیکھا.....؟“

”دیکھو.....! کہیں نظر آئے تو اسے گھر پہنچانا۔“

سارا سارا دن وہ شہر کی خاک چھانتی۔ ہر دوسرے بچے پر فراز کا گمان کر کے اس کی طرف

پکیتی تھی۔ پھر مایوس ہو کر شام ڈھلے گھر کی راہ لیتی تھی۔ اس دوران ایک بار نواز آیا تو اس کا ہاتھ اس کے گریبان تک چلا گیا۔

”تم نے مارا ہے میرے فراز کو۔ تم قاتل ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

وہ جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ دھکے دے کر نواز کو نکال دیا۔

اسی رات مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے سے پہلے اسے صالح کا خیال آیا تو امید کی ہلکی سی کرن دل میں روشن ہوئی۔

”وہ یقیناً میری مدد کرے گی۔“ وہ سوچنے لگی۔ ”ہمیشہ وہی میرے کام آئی ہے۔ اوہرا تنے

روں سے پتا نہیں کیوں نہیں آئی۔ خیر میں خود ہی کل اس کے پاس جاؤں گی۔ اور کہوں گی میری مدد کرے۔ میرے فراز کو کہیں سے ڈھونڈ کر لا دے۔ وہ بڑی آدمی ہے۔ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔“

امید کی کرن نظر آئی تو تھوڑا حوصلہ بھی ہوا اور کچھ دیر کو سوئی بھی ورنہ نیندیں تو فراز کے ساتھ ہی کہیں کھو گئی تھیں۔

صبح سویرے ہی وہ رابعہ کو لے کر نکل پڑی۔ ان چند دنوں میں وہ پورے شہر میں اتنی بار

پکارتی تھی کہ راستوں سے کافی حد تک آشنائی ہو گئی تھی۔ صالح کا دیا ہوا کارڈ اس کی مٹھی میں دبایا تھا۔

شہر کے صاف ستھرے علاقے میں پر شکوہ عمارتوں کو دیکھتی ہوئی وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ پھر ایک بڑے سے بچے کی پیشانی پر انھنصر لکھا دیکھ کر وہ رک گئی۔ کارڈ پر بھی یہی نام لکھا تھا۔

نمبر ملایا، نمبر بھی وہی تھا۔ قدرے سکون کا سانس لیا اور رابعہ کی کلائی پر گرفت مضبوط کرتی ہوئی گیت کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا وہ بلا جھجک اندر چلی جائے گی۔ لیکن چوکیدار نے اسے روک دیا۔

”اے مائی.....! اندر کہاں جا رہی ہو.....؟“ چوکیدار نے اسے کوئی بھکارن سمجھا تھا۔ اس لیے سخت آواز میں بولا۔ وہ صلیے سے بھی تو ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اپنا ہوش ہوتا تو یہاں آنے کے لیے کوئی اہتمام بھی کرتی۔

”مجھے صالچہ سے ملنا ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے نام لیا تو چوکیدار نرم پڑتا ہوا بولا۔

”یہ صاب نہیں ہیں۔“

”وہ اعتدیا گئی ہوئی ہیں۔“

”انڈیا.....!“ امید کی آخری کرن بھی بجھنے لگی۔ ”خضر صاحب ہیں۔“

”وہ بھی نہیں ہیں۔ کل شام کراچی گئے ہیں۔ دودن کے بعد آتا۔ صاحب آجائیں گے۔“

”دودن.....“ مری مری آواز سے دہرایا اور قدموں کو واپس کے لیے موڑ لیا۔ اب وہاں

رکنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ واپسی کے سارے راستے بے نشان ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں ایسی دھند آسائی تھی کہ دو قدم کے فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بمشکل تمام گھر تک پہنچی اور دہلیز پار کرتے ہی سارے حوصلے ٹوٹ گئے۔

”اب کہاں تجھے ڈھونڈوں۔ جانے کس کے ہتھے چڑھ گیا۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ اسے چپ کراتے کراتے بالآخر خود بھی رونے لگی تھی۔

”امی.....! آپ نہ روئیں۔ فراز آجائے گا۔“

رابعہ نے پھر آس بندھانی چاہی۔ لیکن وہ مکمل طور پر مایوسیوں کے اندھیاروں میں ڈوب چکی تھی۔ شام تک وہ تیز بخار میں جلنے لگی اور سینے کی تکلیف پھر شروع ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ آنگن میں پچھی چار پائی پر لیٹی دروازے پر نظریں جمائے رہی۔ موسم کچھ اُبر آلود تھا اور فضاؤں میں خنکی سمائی تھی۔ جسے وہ محسوس بھی کر رہی تھی۔ پھر بھی وہاں سے نہیں اٹھی۔ رابعہ کو اس نے اندر سلا دیا تھا۔ اور خود فراز کی راہ دیکھ رہی تھی۔ شاید اوپر والے کورجم آجائے۔ لیکن اوپر والے کورجم تو تب آتا جب اس نے اس کے نصیب میں کوئی سکھ لکھا ہوتا۔

”میرے اللہ.....!“ اس کی نظریں دور آسمانوں پر بھٹکنے لگیں۔ ”میری طاقت سے زیادہ مجھے نہ آتا۔ مجھ سے یہ دکھ برداشت نہیں ہو رہا۔ پتا نہیں میرا بچہ کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ تو میرے اللہ اسے اپنی امان میں رکھنا اور کسی طرح اسے گھر کا راستہ دکھا دے۔“

اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی اور وہ یونہی روتے روتے سو گئی

رات کا جانے کون سا پہرا۔ جب بارش ہونے لگی۔ اس کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی۔ لیکن وہ اٹھ کر اندر نہیں گئی۔ اصل میں آنکھ کھلتے ہی اسے فراز کا خیال آیا تھا اور ساتھ میں یہ خیال بھی کہ وہ

بارش میں نہ بھیگ رہا ہو۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ تو بارش میں بھیکتا ہو اور وہ چھت تلے چلی جائے۔

بقیہ تمام رات بارش وقفے وقفے سے ہوتی رہی تھی۔ اور صبح جب ہوئی تو وہ تنگی چار پائی پر

بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں اب بھی دروازے پر تکی تھیں۔

بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں اب بھی دروازے پر تکی تھیں۔

ایک بار یہیں بیٹھ کر اماں نے دعا کی تھی کہ مجھے آزمائشوں سے نکال اور اوپر والے نے

آزمائشوں کے ساتھ دنیاوی جہمیلوں سے بھی نکال لیا تھا۔ اور رات وہ دعا کر رہی تھی۔ ”میری

طاقت سے زیادہ مجھے نہ آتا۔“ اس نے مزید نہیں آزمایا اور فراز کو گھر کا راستہ دکھانے کی بجائے

اسے اپنی طرف کا راستہ دکھا دیا تھا۔

رابعہ کو اٹھانے والی آواز خاموش تھی۔ اس لیے وہ بچی دن چڑھے تک سوئی رہی۔ اپنی مرضی

سے اٹھی۔ کمرے میں امی کو نہ پا کر باہر آئی اور اسے چار پائی پر لیٹے دیکھا۔ بارش کے بعد چمکیلی

دھوپ اس کے وجود کو چھو رہی تھی۔

”امی.....!“ پکارتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ بار بار پکارا کندھا بھی ہلایا۔ لیکن وہ نہیں

اٹھی۔ رابعہ حیران ہوئی اور جا کر عرفان چاچا کو بلا لائی۔ عرفان چاچا کیا آئے کہ اس کا گھر عورتوں

سے بھرنے لگا تھا۔

”کیا ہوا ہے امی کو.....؟“ اس نے کسی عورت کا دامن تھام کر پوچھا۔

”تمہاری امی اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔“

”اللہ میاں کے پاس..... مجھے چھوڑ کر۔“ اس کی آواز میں دکھ سمٹ آیا۔ اور دل کی نرم نرم

زمین پر اس خیال نے بیج بو دیا۔

”میں اکیلی ہو گئی ہوں۔“

خواتین کلام پاک پڑھنے میں مصروف ہو گئیں اور کچھ باتوں میں۔ وہ چپ چاپ ایک

کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔

وقت کے ظالم سپنے نے پہلے بھائی چھینا۔ اب ماں چھین لی۔ اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

لیکن کوئی مہربان آغوش نظر نہیں آرہی تھی جس میں منہ چسپا کر رو سکے۔ آنسوؤں کو اندر ہی پیتی خالی

خالی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھ گئی۔ یونہی بھٹکتی ہوئی اس کی نظریں دروازے کی طرف انھیں تو

وہ زرد پڑ گئی۔ عرفان چاچا کے ساتھ آیا آ رہے تھے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر گھٹنوں میں منہ چسپا لیا

تھا۔

پھر سب اس کی امی کو لے کر چلے گئے تھے اور گھر بھی آہستہ آہستہ خالی ہو گیا۔ صرف ایک

خاتون رہ گئی تھی جو اب کے آنے تک موجود رہی۔ اور اب آئے تو اسے بلا کر کہنے لگے۔
 ”یہ تمہاری اماں ہیں۔ اب یہیں تمہارے پاس رہیں گی۔“

”اماں.....!“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ خالی خالی نظروں سے اس عورت کو دیکھنے لگی۔ جس کے چہرے پر سختی تھی اور انداز میں بیزار سی۔ اس کا دل چاہا جیج جیج کر کہے۔ یہ میری اماں نہیں ہیں۔ لیکن دل کی نرم زمین میں دبے ”میں اکیلی ہوں“ کے بیج نے اسے بولنے سے باز رکھا اور زندگی کے اس مقام پر ہی وہ جان گئی کہ اس کی بولنے کی آزادی اور احتجاج کا حق سب کچھ امی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔

وہ کچھ بولے گی تو خطا وار ٹھہرے گی۔

احتجاج کرے گی تو سزاوار ٹھہرے گی۔

کوئی مہربان ہاتھ بھی نہیں جو سزا سے بچا سکے۔

سوئم کے بعد وہ لڑکا بھی اسی گھر میں آکر رہنے لگا جس کی قیمتی کا خیال کر کے ابانے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔ نادر جس کے بارے میں ابانے امی کو بتاتے ہوئے کہا تھا۔ تمہارے بچوں سے کچھ بڑا ہے۔ وہ اس سے دو سال ہی بڑا ہوگا۔ لیکن اس کے انداز سترہ اٹھارہ سالہ لڑکوں کے سے تھے۔ یہ تمہارا بھائی ہے فراز کی طرح۔ لیکن اسے اس میں فراز جیسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ بلکہ اس سے تو عجیب طرح کا خوف محسوس ہوتا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ شروع کے دو چار دن ہی اماں کا رویہ اس سے ٹھیک رہا تھا۔ پھر فوراً ہی وہ روایتی سوتیلی ماں کے روپ میں آگئیں۔ اور سہنا تو جیسے اس گھر کی مٹی میں لکھا تھا۔ پہلے اماں پھر امی اور اب وہ یعنی رابعہ حق نواز۔ اتنی سی عمر میں ہر بات سہنے کا حوصلہ پیدا کر رہی تھی۔

وہ پانچویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ اماں نے آتے ہی سب سے پہلے اسے اسکول سے اٹھا دیا۔ یہ کہہ کر کہ کون سا تمہارا باپ کما کر لاتا ہے۔ اسے اسکول چھوڑنے کا بہت دکھ ہوا اور فوری طور پر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب وہ بڑی آدمی نہیں بن سکے گی۔

پھر آہستہ آہستہ گھر کی ساری ذمہ داریاں اس کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر اماں بالکل غائب ہو گئیں۔ اس نے اپنی امی کو حالات کی چکی میں چپ چاپ پستے دیکھا تھا۔ اور وہ بھی ان کی جیجی تھی۔ کوئی حرف شکایت زبان پر لائے بغیر اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

اس جیجی کے پاس وہ چپ چاپ سن لیتی۔ جو حکم دیتیں فوراً بجالاتی۔ سارا دن وہ اسے پھر کی طرح

مکدے پر گرتے ہی اسے بے تحاشا تھکن کا احساس ہوتا۔ دل چاہتا ہے خبر ہو کر سو جائے۔ لیکن وہ اپنی خواہش کو دباتے ہوئے اپنا بست لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ کتابیں جنہیں وہ کتنی بار پڑھ چکی تھی دوبارہ پڑھتی۔ اس کے بعد وہ امی کو یاد کرتی اور یہ بات دہراتے ہوئے سو جاتی ”میں بڑی آدمی بنوں گی۔“

○ ○ ○

صالحہ تین مہینے کے بعد انڈیا سے واپس آئی۔ خاصی خوش تھی اور یہ خوشی ہی کی بات تھی کہ اس کے ماما جی اور پتا جی اب اس سے خفا نہیں رہے تھے۔ وہ انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اپنی اس زندگی میں بہت خوش اور پرسکون ہے۔

تین مہینے وہ اپنے گھر اور بچوں سے دور رہی تھی۔ اب آئی تو اس کا زیادہ وقت بچوں میں گزرنے لگا۔ ان کی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں کا اس نے از سر نو جائزہ لیا۔ پھر ہر بات معمول کے مطابق دیکھ کر ہی اسے اطمینان ہوا تھا۔ وہ بچوں سے دور ضرور رہی تھی لیکن غافل نہیں تھی۔ گوکہ بچوں کے پاس بوا موجود تھی پھر بھی اس کا سارا دھیان ادھر ہی رہا تھا۔ گھر سے مطمئن ہوئی تو خضر کا تنقیدی جائزہ لینے لگی۔

”خاصے کمزور ہو گئے ہو۔ میرا خیال ہے تم نے اپنی طرف سے لاپرواہی برتی ہے۔“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں نہیں بلکہ تم میری طرف سے لاپرواہ ہو گئی ہو۔“ وہ شکوہ کرنے لگا۔

”میں.....؟ نہیں تو.....“

”کیوں.....؟ جب سے آئی ہو بچوں میں لگی ہوئی ہو۔ میں تو جیسے پس منظر میں چلا گیا ہوں۔“

”نہیں خضر.....! اصل میں، میں بچوں کو چیک کر رہی تھی کہ کہیں میری غیر موجودگی میں وہ بگڑ تو نہیں گئے۔“

”میرا خیال نہیں آیا تمہیں.....؟ میں بھی تو بگڑ سکتا تھا۔“ اس کے یہ کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر بڑے یقین سے بولی۔

”تم نہیں بگڑ سکتے۔“

”کیوں.....؟“

”اتنا زعم.....!“ وہ مسکرایا۔

”آزمادیکھو.....!“

”آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت پہلے تمہاری محبتوں پر ایمان لا چکا ہوں۔“

”اچھا.....!“ وہ خوشدلی سے ہنسی۔

کچھ دن اور گزرے۔ جب ہر بات پہلے والے معمول پر آگئی تب وہ فراغت سے بیٹھی اور ایسے ہی فراغت کے لمحوں میں اسے مہر النساء کا خیال آیا۔ تو وہ اسی وقت اس کی طرف چل پڑی۔ اس کے گھر میں داخل ہوئی تو استقبال ایک دوسری عورت نے کیا۔ جسے وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔

”مہر النساء کہاں ہیں.....؟“ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”آپ بیٹھیں تو.....“ زرینہ بیگم اس کی قیمتی کپڑوں اور امیرانہ انداز سے مرعوب تھیں۔ وہ

بیٹھ گئی اور پھر اپنا سوال دہرایا۔

”مہر النساء تو مر گئی۔“

”کیا.....؟“ اس کی آواز کنٹرول سے باہر ہو گئی اور وہ غیر یقینی سے زرینہ بیگم کو دیکھنے لگی۔

”ہاں.....! اسے مرے ہوئے تو دو مہینے ہو گئے ہیں اور آپ کون ہیں.....؟“

”میں اس کی کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ ہوں۔“ ضبط کرتے کرتے بھی اس کی آنکھوں میں

آنسو آگئے جنہیں اس نے رومال میں جذب کر لیا۔

”کیا مطلب.....؟“ زرینہ بیگم پوچھنے لگیں۔

”میں اس کی بہن ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ پھر پوچھنے لگی۔ ”اس کے بچے کہاں

ہیں.....؟ فراز اور رابعہ۔“

”فراز تو جی اس کی زندگی ہی میں گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور اسے فراز ہی کا غم لے ڈوبا۔

جب کہ رابعہ بیٹیں موجود ہے۔“

”فراز گھر چھوڑ گیا..... کیوں.....؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”پتا نہیں..... میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ زرینہ بیگم نے مکاری سے کام لیا۔

”لیکن وہ تو بہت نیک بچہ تھا۔ کہیں نواز نے تو.....“

”نواز کا نام کیوں لے رہی ہیں.....؟ زرینہ بیگم فوراً بات کاٹ گئیں۔ ”وہ اس کا باپ ہے

کوئی دشمن تو نہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں.....! اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کون ہو۔“

”میں نواز کی بیوی ہوں۔“ زرینہ نے ایک ادا سے کہا۔ تو وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”رابعہ کو بلاؤ۔ میں اس بچی سے مل لوں۔“ اس نے کہا تو زرینہ وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دے

ڈالی۔

”رابعہ.....!“ صالحہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

میلے کپڑے، چپلوں کی قید سے آزاد پیر جو مٹی دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے وہ خوبصورت بال جن کی مہر و صبح و شام حفاظت کیا کرتی تھی، گرد کی تہوں میں چھپ کر اپنی اصل رنگت کھو رہے تھے اور سہمی ہوئی آنکھیں جن میں ایک انجانا خوف ٹھہر گیا تھا۔ وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکی کیونکہ آنکھوں میں نمی نے اتر کر دھند کی ہلکی سی چادر تان دی تھی۔

○ ○ ○

صالحہ بار بار پلکوں کو جھپکنے لگی۔ آنکھوں میں اتری ساری نمی اس نے اپنے اندر اتاری۔ شاید

وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ دھند چھٹی تو رابعہ کا چہرہ نظر آیا۔ ساتھ ہی مہر کی آواز کی بازگشت۔

”میرے بعد کوئی نہیں ہے۔ جوان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھے۔ ایک تم ہی ہو جو۔“

”میں تمہاری تسلی کی خاطر وعدہ کرتی ہوں۔“

اسے اپنا وعدہ یاد آیا تو ہاتھ بڑھا کر رابعہ کو اپنے پاس کھینچ لیا۔ پھر اس کے میلے کپڑوں کا

خیال کیے بغیر اپنی گود میں بٹھایا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے زرینہ سے کہنے لگی۔

”میں نے مہر سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد اس کے بچوں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ حق

نواز کو بلاؤ۔ میں اس کی اجازت سے رابعہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

زرینہ بیگم نے ایک پل میں بہت ساری باتیں سوچ ڈالیں۔ رابعہ چلی گئی تو ایک مفت کی

نوکرانی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اور پھر یہ بھی کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ مہر النساء کی بیٹی کسی اچھے گھر

میں پروان چڑھے۔ فوراً کہنے لگی۔

”نواز کسی طرح بھی اپنی بیٹی کو آپ کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔“

”کیوں.....؟“

”ظاہر ہے ایک ہی بیٹی ہے اس کی۔“

”ایک ہی ہے تو کون سا اس کا خیال رکھتا ہے۔ اپنا ہوش تو ہے نہیں اسے۔“

”آپ کچھ بھی کہیں جی۔ رابعہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔“ اپنی طرف سے زرینہ بیگم

نے فیصلہ دے دیا۔

”مجھے نواز سے بات تو کر لینے دو۔“

”اس سے کیا بات کریں گی۔ میں جو ہوں اور میں اسے نہیں بھیج سکتی۔ کیونکہ لوگ تو میرے ہی سرالزام رکھیں گے کہ سوتیلی ماں تھی۔ ایک بچی کو نہ رکھ سکی۔“

اس کی بات مناسب تھی اس لئے صالحہ اس سے کچھ کہنے کے بجائے رابعہ سے پوچھنے لگی۔
”میرے ساتھ چلو گی.....؟“ رابعہ جواب دینے کے بجائے زرینہ کی طرف دیکھنے لگی۔ گو کہ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کے چہرے کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ رابعہ کے منہ سے نہ سننا چاہتی تھی۔ اور رابعہ ان دو مہینوں میں اس کا ہر انداز سمجھنے لگی تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی بات سے اختلاف کر کے اسے کہیں امان نہ ملے گی۔

”کہو بیٹا.....! میرے ساتھ چلو گی نا.....؟“ صالحہ نے دوبارہ محبت سے پوچھا۔

”نہیں.....“ اس نے سر جھکا کر انکار کیا۔

”کیوں.....؟“

”میں یہیں اماں کے پاس رہوں گی۔“ اس کے جواب سے زرینہ بیگم کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جسے محسوس کر کے صالحہ سمجھ گئی کہ رابعہ اس کے ڈر سے انکار کر رہی ہے۔ اسے افسوس ہوا اور دکھ بھی لیکن وہ زیادہ اصرار نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی زبردستی اپنی بات منوان سکتی تھی۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ رابعہ پر اس کا کوئی حق نہیں تھا جب کہ زرینہ بیگم کچھ حقوق لیے بیٹھی تھی۔

صالحہ یہاں سے اٹھ کر گئی تو بہت آزرده تھی۔ ایک تو مہر النساء کی بے وقت موت، دوسرے رابعہ کی حالت نے اسے بہت دکھ پہنچایا تھا اور خضر سے ذکر کرتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

”بعض لوگ اتنے حراماں نصیب کیوں ہوتے ہیں۔ خضر۔ اچھے دنوں کی آس میں اک عمر بتاتے ہیں اور پھر اچھے دنوں کے آنے سے پہلے ہی چل دیتے ہیں۔“

”اس میں ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ خدا جس کے نصیب میں جو لکھ دے۔“ خضر نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”یہی دنیا کے رنگ ہیں صالحہ اور انہی مختلف رنگوں کی بنا پر ہمارے لیے اس دنیا میں کشش بھی ہے۔ یقین کرو اگر یہ صرف ایک ہی رنگ سے بنی ہوتی تو ہم بہت جلد اس سے اکتا جاتے۔ تم اپنے گھر کی مثال لے لو۔ کیا تم نے ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کو مختلف رنگ نہیں دیے۔ اسی طرح اس نے ہر انسان کے نصیب کو ایک الگ رنگ دیا ہے۔ کسی کے نصیب کو آسودگیوں کے رنگوں سے سجایا ہے اور کئی محرومیوں کے رنگ بھر دیے ہیں۔“

پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”تم پلیز اس طرح مت روؤ۔“

”مہر و شاید جان گئی تھی کہ وہ زیادہ عرصہ حالات سے نہیں لڑ سکے گی۔ اور وہ بچوں کی طرف سے بہت فکر مند تھی، پھر میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں اس کے بچوں کا خیال رکھوں گی۔“ ذرا دیر رک کر کہنے لگی۔

”میں رابعہ کو لانا چاہتی تھی لیکن اس کی ماں نے نہیں آنے دیا۔“

”چلو.....! تم نے تو اپنی سی کوشش کر دیکھی نا..... اب دل پر بوجھ مت رکھو۔“

”لیکن خضر.....! مجھے لگتا ہے، رابعہ اپنی سوتیلی ماں سے بہت خوفزدہ ہے جیسی اس نے

میرے ساتھ آنے سے انکار کیا۔“

”یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے صالحہ.....! اور تم ان کے معاملات میں اس حد تک دخل اندازی مت کرو کہ انہیں ناگوار گزرنے لگے۔ اور سنو۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس عورت نے رابعہ کو یہاں نہیں آنے دیا۔ ورنہ اس کے یہاں حق نواز اس گھر کا راستہ دیکھ لیتا اور جس قماش کا وہ آدمی ہے تو میں اس کا یہاں آنا کبھی بھی پسند نہیں کروں گا۔ اور تم سے بھی میں کہہ رہا ہوں کہ جب تک مہر النساء تھی۔ میں نے تمہیں نہیں روکا لیکن اب تم وہاں نہیں جاؤ گی۔ اسے میرا حکم سمجھ لو۔“

”لیکن خضر.....! وہ بچی۔“

”بس اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔



وقت کروٹ پر کروٹ بدلتا چلا گیا۔

موسم بدلتے رہے۔

کبھی بہاروں نے خزاؤں کو اپنی آغوش میں سمیٹا اور کبھی خزاؤں نے بہاروں کا دامن تھاما۔

یونہی آنکھ پھولی کھیلے برسوں بیتے۔

اور.....

گزرتے برسوں نے جہاں صالحہ بیگم اور خضر حیات کو جوانی کی دہلیز پار کرادی وہاں بچوں کو اس دہلیز پر لاکھڑا کیا۔

سب سے بڑے احتشام جو حال ہی میں ایم بی اے کر کے لوٹے تھے ان کے بعد حسام

میڈیکل کے آخری سال میں جب کہ نائلہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔ پھر انعام تھا انجینئرنگ کے دوسرے سال میں اور آخر میں صبیحہ بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ سب اپنے اپنے راستے پر بڑی کامیابی سے چل رہے تھے۔ بے جی (صالحہ بیگم) نے ان سب پر بڑی محنت کی تھی۔ اور یہ کچھ تو ان کی محنتوں کا ثمر تھا اور کچھ قسمت شروع ہی سے ان پر مہربان رہی تھی۔

بے جی نے شروع ہی سے گھر کی جو روٹین بنارکھی تھی۔ اس کی پابندی اب بھی سب پر لازم تھی۔ صبح نماز کے وقت ہی سب بیدار ہو جاتے اور اس کے بعد سونے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔ خواہ چھٹی کا دن ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ان کا حکم تھا کہ رات نو بجے سے پہلے سب کو گھر میں موجود ہونا چاہیے اور ٹھیک نو بجے وہ بیرونی گیٹ بند کروا دیتی تھیں۔

بچیس برسوں میں ”الخضر“ میں کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلے یہ صرف بڑا گھر تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ خضر حیات اسے جدید طرز سے تعمیر کرواتے گئے۔ اب یہ باہر سے جتنا خوبصورت تھا، اس سے کہیں زیادہ اس کی خوبصورتی اور سجاوٹ اندر سے دیکھنے کے قابل تھی۔ اور اس پورے الخضر پر بے جی کی حکمرانی تھی۔ اور یہ حکمرانی ان کا حق بھی تھا کہ اسے سجانے ستوارنے سے لے کر اس کے اندر کا پرسکون ماحول سب ان کی کاوشوں کا مرہون منت تھا۔ اور آج الخضر کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ رنگین قفوں سے سجایا گھر قلعہ نور بنا ہوا تھا۔ اندر کے ماحول میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچتی تھی۔ ہال کمرے میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گانے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ ان کے دبے دبے مترنم قہقہے باہر تک سنائی دے رہے تھے۔ یہ خوبصورت ہنگامہ احتشام کی شادی کے سلسلے میں تھا۔

جس دن احتشام ایم بی اے کر کے لوٹے تھے اسی وقت سے بے جی نے ان کے لیے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دی تھیں۔ اور بالآخر ان کی نگاہ انتخاب صائمہ پر ٹھہری۔ گھر کے باقی افراد کو بھی صائمہ بہت پسند آتی تھی۔ اور یوں چٹ مگنی پٹ بیابہ کے مصداق جلد ہی یہ شادی طے پا گئی۔ گھر کی پہلی شادی تھی۔ اس لیے خوشی کے ساتھ ساتھ بوکھلاہٹ بھی سوار تھی کہ کہیں کسی بات میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

ایسے میں بے جی چارے حسام کی شامت آئی ہوئی تھی کہ جب بے جی کو کوئی چیز یاد آئی۔ اسی وقت اسے بازار بھیجتیں۔ وہ بے جی کے سامنے احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بی زبان سے کئی بار کہہ چکا کہ آپ ایک ہی بار لٹ بنا دیں۔ اب بھلا بے جی کو لٹ بنانے کی فرصت کہاں تھی۔

”مجھے کوئی ایسا بہت سارا سامان تو ملگوا نہیں۔ بس ابھی ایک دو چیزیں ہیں۔ لے آؤ۔“

وہ چلا جاتا اور اس کے جانے کے بعد انہیں ایک دو چیزیں اور یاد آ جاتیں۔ ابھی ابھی وہ لوٹا تھا اور اب پھر بے جی اس کے سر پر کھڑی تھیں۔ اس نے بہت آرام سے ان کی کلائی تھام کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”بے جی.....! آپ کو میری حالت پر رحم نہیں آتا۔“ وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

”جیئے.....! ایسے موقعے روز روز تو نہیں آتے۔“

”بے شک روز روز نہیں آتے لیکن کیا یہ ضرورت ہے کہ میں معمولی معمولی چیز کے لیے دوڑا جاؤں۔ آخر آپ ایک ہی دفعہ لٹ کیوں نہیں بنا لیتیں۔ اور اب تو بازار والے بھی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“

”کیا.....؟“ اس بات پر بے جی نے اسے گھورا۔

”ظاہر ہے جب دن میں دس چکر لگاؤں گا مشتبہ تو ٹھہروں گا ہی۔ اور اب موسم کے تیور دیکھ رہی ہیں آپ، لگتا ہے کسی ہل بھی بارش برسنے لگی گی۔“

اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

”چلو..... اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو جائے۔ تم نکل جاؤ۔“

”بے جی.....!“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بے جی اٹھ کھڑی ہوئیں جس کا مطلب تھا۔ وہ مزید بحث نہیں کرنا چاہتیں۔

”اگر اجازت ہو تو ایک کپ چائے پی لوں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”پی لو.....“ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ اس کے بعد فوراً نکل جانا۔

وہ اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ بوا سے چائے بنوا کر وہیں کھڑے کھڑے پی پھر انہیں قدموں باہر نکل آیا۔ نائلہ اور صبیحہ برآمدے میں کھڑی موسم پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ وہ قریب سے گزرنے لگا تو نائلہ نے پکار لیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو.....؟“

”بازار.....!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”غالباً ابھی تو تم بازار سے آئے تھے۔“

”غالباً نہیں یقیناً.....“

”پھر.....؟“ نائلہ اس کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر مسکرائی۔

”بے جی کی مہربانی ہے۔ انہیں میرا گھر میں بیٹھنا پسند نہیں آ رہا۔“

”اصل میں بے جی کو شہ ہو گیا ہے کہ ہماری سیلیوں کو۔“

”کیا.....؟“ وہ نالہ کی بات پوری ہونے سے پہلے چیخا۔ ”میں ایسا نظر آتا ہوں۔“
 ”نہیں میرے بھائی تم ایسے نظر تو نہیں آتے لیکن اب اندر کا حال تو ہم نہیں جانتے ناں جبکہ
 بے جی تو ایک نظر میں ہمارے اندر تک جھانک لیتی ہیں۔“ نالہ اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھی۔
 صبیحہ نے اس کا ساتھ دیا۔ کہنے لگی۔

”میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ حسام بھائی رومانہ کو دیکھ کر۔“

”خبردار.....!“ اس نے صبیحہ پر مکا تان لیا پھر بے جی کو کمرے سے نکلنے دیکھ کر اس نے
 اپنی ہی ہتھیلی پر مکا دے مارا۔

”تم ابھی گئے نہیں۔“ بے جی کے لہجے میں سرزنش تھی۔

”میں جا رہا تھا بے جی! ان دونوں نے روک لیا۔“

”ہم نے..... نہیں تو۔“ وہ صاف مکر گئیں تو وہ دونوں کو گھورتا ہوا جلدی سے برآمدے کی
 بیڑھیاں اتر گیا۔ گھر سے نکلا تو وہ خاصا جھنجھٹایا ہوا تھا لیکن خوشگوار موسم نے بہت جلد اس کی
 جھنجھٹاہٹ دور کر دی۔ ابھی اس کی گاڑی مین روڈ تک ہی آئی تھی کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی اور نم
 ہوا اس کے چہرے کو چھونے لگی تھی۔ وہ ہوا کی شوخی پر خاصا محفوظ ہوا اور سسٹی پر خوبصورت دھن
 بجاتے ہوئے گاڑی کی اسپید قدرے بڑھادی۔ وہ چاہتا تھا بارش تیز ہونے سے پہلے بازار کا کام
 کر لے۔ اور اس نے بہت جلدی میں بے جی کی بتائی ہوئی چیزیں خریدیں۔ پھر جس وقت وہ
 سامان سمیت کر گاڑی کی طرف آیا بارش جم کر برسنے لگی تھی۔ جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی چیزیں
 پچھلی نشست پر پھینکیں اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

اتنی سی دیر میں وہ کافی بھگ گیا تھا۔ انگلیوں کی مدد سے بالوں پر رکے بارش کے قطرے
 جھٹکنے کے بعد شو پیر سے چہرہ صاف کیا پھر گاڑی اشارت کر کے شفاف سڑک پر لے آیا۔ اب
 اسے جلدی نہیں تھی۔ اطمینان سے ڈرائیونگ کرتا ہوا پناہ کی تلاش میں بھاگتے دوڑتے لوگوں کو
 دیکھنے لگا۔

ایک دلچسپ نظارہ تھا جس نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ بارش بھی تو یوں
 برس رہی تھی جیسے اب کے بعد پھر کبھی نہ برے گی۔ وند اسکرین پر تیزی سے حرکت کرتے وائپر بھی
 اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ ایک لمحے میں ہی سامنے کا منظر دھندلا جاتا تھا۔ اس نے احتیاطاً
 اسپید بہت آہستہ کر دی۔

یادی بھٹکتی ہوئی اس کی نظریں بائیں جانب انھیں تو وہ چونک گیا۔ روڈ کے کنارے ایک
 لڑکی تنہا کھڑی تھی۔ بارش میں شرابور اپنے آپ میں سمٹتی ہوئی کافی خوفزدہ بھی لگ رہی تھی۔ اس

نے گاڑی اس کے قریب جا کر روک دی اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر کہنے لگا۔
 ”آجایئے محترمہ.....! میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔“ گاڑی اس کے قریب روکنے اور اسے
 بیٹھنے کی پیشکش کرنے میں اس کے ارادے کو بالکل دخل نہیں تھا۔ لڑکی قدرے سہم کر اس کی طرف
 دیکھنے لگی۔

”اس وقت کوئی سواری نہیں ملے گی۔ اور بارش رکنے کا امکان بھی نہیں ہے۔“

لڑکی جواب دینے کے بجائے اپنے پیچھے یوں دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

”کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ.....؟“ وہ پوچھنے لگا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کوئی اور ہے تو اسے بھی بلا لیں۔“ اس نے خلوص سے کہا۔ لڑکی خاموش رہی۔

”آپ سن نہیں سکتیں یا بول نہیں سکتیں.....؟“

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ اسے گونگی بہری کچھ کر اشارے سے کہنے لگا کہ آ
 کر گاڑی میں بیٹھ جائے۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ بیٹھ تو گئی لیکن اتنی خوفزدہ تھی کہ ایک لفظ
 شکریہ تک نہ کہہ سکی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف کا دروازہ بند کیا پھر گاڑی اشارت کر دی۔
 کچھ دیر تک خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ پھر اس سے پوچھنے کی غرض سے کہ اسے کہاں جانا
 ہے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے متوجہ کرنا
 چاہتا تھا۔ اسے گونگی بہری کچھ کر اس کے کندھے کو ہلکے سے چھو ڈالا۔ وہ ایک دم اس کی طرف ہلکی
 یوں جیسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ آنکھوں میں خوف کے سائے آنسوؤں کی صورت لرزنے لگے تھے۔ اور
 یہی ایک لمحہ تھا کہ وہ ان لبریز پیناٹوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وقت تھمتا ہوا لگ رہا تھا۔

دل تاداں نے بغاوت کا بگل بجاتے ہی سارے دروا کر دیے۔ اور وہ۔ کچ، کچ قدم اٹھاتی
 ایک کے بعد ایک دروازہ پار کرتی گئی یہاں تک کہ وہ مقام آ گیا جہاں تک ہر ایک کی رسائی ممکن
 نہیں۔

”میرے خدا.....!“ وہ چونکا اور سنہیل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ بس چند ساعتیں ہی تو جیتی تھیں
 اور وہ مسافتیں طے کر آیا تھا۔ جبکہ وہ حیران حیران ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”معاف کیجیے گا۔“ وہ کھٹکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں پوچھنا چاہتا تھا آپ کو
 کہاں جانا ہے؟“

”مزگ.....!“ اس نے بہت دھیمی آواز میں بتایا۔

”ارے آپ بول بھی سکتی ہیں۔“ وہ لہجے میں شوخی بھرتا چاہتا تھا۔ لیکن جانے کیوں ممکن نہ
 ہوا۔ وہ کیا کہتی پھر رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اور وہ بار بار کن آنکھوں سے اس کا جائزہ

”رابعہ.....! رابعہ حق نواز.....!“

اس نے کہا اور دروازہ کھول کر اتر گئی۔ اور وہ بہت دور تک اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ چند قدم کے بعد ہی چھاجوں برستے مینے دھند کی چادر تان دی تھی۔

○ ○ ○

وقت کہیں نہیں رکتا۔ اس کا کام گزرتا ہے اور یہ گزری جاتا ہے۔ اس گھر میں جہاں رابعہ پیدا ہوئی۔ یہاں بھی وقت پہلو بدلتا ہوا بہت سے ماہ سال پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ان گزرتے برسوں میں کوئی پل ایسا نہیں تھا جسے وہ زاوراہ بنا سکتی اور نہ ہی آنے والے وقت کو سوچتے ہوئے کوئی امید کی کرن جگمگاتی تھی کہ جسے وہ اپنی گرفت میں لے سکتی۔

شروع کے ماہ و سال بہت کڑے تھے۔ زرینہ بیگم نے جو سلوک چاہا وارکھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ پھر جب زرینہ بیگم نے یکے بعد دیگرے چار بچوں کو جنم دیا تب اس کی طرف سے ذرا اس کی توجہ ہوئی۔ کچھ دن خود بچوں میں الجھی رہی پھر یہ ذمہ داری بھی اس کے سر ڈال دی۔ جسے نبھاتے ہوئے اس نے لڑکپن کو خیر باد کہا۔ اور لڑکپن سے نکلتے ہی وہ اپنی ماں مہر النساء کا رنگ روپ چرا لائی۔ وہی رنگ، وہی سراپا، وہی ہی جھیل سی آنکھیں، ویسے ہی تراشیدہ لب اور لبوں کے کنارے سیاہ تل جو دیکھنے والے کو مبہوت کر دیا کرتے تھے۔

اس گھر میں اس کی سوتیلی ماں زرینہ بیگم کا بیٹا نادر بھی تھا۔ جسے شروع میں اس کے ساتھ خاصی پر خاش رہی۔ جو بات بات میں اسے ٹوکتا اور اکثر ماں کی شہ پر گالیاں بھی دیا کرتا تھا۔ لیکن لڑکپن کے بعد اس کے انداز میں خود بخود تبدیلی آ گئی۔

وہ کسی تیسرے درجے کے عاشق کی طرح اس پر شمار ہونے لگا۔ یہ صورت حال اس کے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ لیکن وہ کس سے کہتی کچھ کہنے کا مطلب اپنی ہی رسوائی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی حرکتیں نظر انداز کرتی رہی۔ سارا دن وہ گھر میں اس جگہ بیٹھتا جہاں وہ مسلسل اس کی نظروں کی گرفت میں رہتی۔ کبھی وہ اونچی آواز میں فحش فلمی گانے گا تا اور کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے مختلف جملے اس کی طرف پھیلتا۔

جان دل..... جان جگر اور جان من قسم کے القاب سے نوازتا اور ایک مستقل نام کٹاری تو ہر دم اس کے ہونٹوں پر رہتا۔

”ظالم دل پر پاؤں رکھ دیا ہے۔“ اس کے ہر قدم پر یہ جملہ بولتا۔ شاید اپنے آپ کو کوئی ہیرو سمجھتا تھا۔ اور ہیرو کے انداز اٹانے میں دلن سے بھی بدتر ہوتا تھا۔ لیکن ایک جگہ اس کی مہربانی

لینے لگا۔ ہیکے ہیکے کپڑوں میں اس کا دلکش سراپا قدرے نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے لاپرواہ نہیں تھی۔ نیلی چادر سے کبھی سر ڈھانپتی اور کبھی ٹھنڈوں تک کھینچنے کی کوشش کرتی۔ کتنا راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔

”پر دیتی ہیں آپ.....؟“ وہ یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگا۔

”جی.....!“ مختصر جواب۔ وہ انتظار کرنے لگا آگے بھی کچھ کہے گی لیکن اس نے اسی جواب کو بہت سمجھ لیا تھا۔

”آپ نے بتایا نہیں۔ کون سے ایر میں ہیں۔“ بالآخر اسے پوچھنا پڑا۔

”بی اے کا امتحان دوں گی۔“

”اچھا..... کس کالج میں ہیں.....؟“

”کسی میں نہیں۔“

”میں پرائیویٹ امتحان دیتی آئی ہوں۔“

”کالج کیوں نہیں جانتیں.....؟“ وہ خاموش رہی اور وہ سمجھ گیا یقیناً کوئی مسئلہ ہے جسے وہ

بتانا نہیں چاہتی۔ وہ سوچنے لگا۔ اب کیا بات کرے لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ یہاں تک کہ مزگ آ گیا۔

”کس طرف جاتا ہے.....؟“ اس کے پوچھنے پر وہ جواب اپنے خیال میں بیٹھی تھی۔ بری طرح

چوکی اور شیشوں سے باہر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اچانک بہت خوفزدہ ہو گئی ہے۔

”کیا بات ہے آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔ کیا میں غلط آ گیا ہوں۔“

”نہیں..... مجھے بس یہیں اتار دیں۔“

”میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہاں سے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

”بارش زوروں پر ہے چند قدم بھی نہیں چل پائیں گی۔“

”مجھے زیادہ دور نہیں جانا۔ پلیز.....!“ لہجے میں التجا تھی اس نے گاڑی روک دی۔ اور اس

کی طرف دیکھنے لگا اور دروازہ کھولنے سے پہلے وہ بھی اس کی طرف پلٹی۔ جھیل جیسی آنکھوں کو حصار میں لیے پلکیں اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر لرزیں اور ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

”شکریہ.....!“

”میں حسام ہوں اور آپ.....؟“

کام آگئی کہ وہ جو اسٹور میں بند ہو کر اپنی پڑھی ہوئی کتابیں بار بار پڑھتی تھی ایک دن اس نے دیکھ لیا تو پوچھنے لگا۔

”بڑا شوق ہے تجھے پڑھنے کا.....؟“

”ہاں.....!“ اس نے سادگی سے اقرار کیا۔

”اور کتابیں لا دوں.....؟“ پتا نہیں وہ مہربان تھا کہ قسمت۔ پہلے تو وہ غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھے گئی۔ جب اس نے دوبارہ پوچھا تو کہنے لگی۔

”کیا واقعی تم مجھے اور کتابیں لا دو گے.....؟“

”ارے تم کہو تو آسمان سے تارے تو ڈکڑ لا دوں۔“ وہ پھر پٹری سے اترنے لگا تو وہ فوراً بول

پڑی۔

”نہیں نادور بھائی.....! تم تو بس مجھے کتابیں ہی لا دو۔“

پھر نہ صرف اس نے کتابیں لا دیں بلکہ اماں کو پتا چلا اور انہوں نے روکنا چاہا تو وہ اس کے

سامنے ڈھال بھی بنا۔

”پڑھنے دے اماں.....! کیا کر لے گی پڑھ لکھ کر۔“ اور یہ اسی کی مہربانی تھی کہ وہ اب لی

اے کی تیاری کر رہی تھی۔

کتابوں نے اسے اتنی آگاہی ضرور دی تھی کہ جس ماحول میں وہ رہ رہی تھی وہ اسے کسی طور

بھی بہتر نظر نہیں آتا تھا۔ ابا نشہ کرتے کرتے اس حال کو پہنچ گئے تھے کہ خود اپنی پہچان کھو رہے تھے۔

اماں کا سارا غصہ ابا کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے انہیں نکلے پن کا طعنہ دیتیں۔ حالانکہ

نکلے تو وہ ہمیشہ رہے۔ اس وقت بھی جب اماں نے ان سے شادی کی۔

چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی اماں نے کبھی ان میں دلچسپی

پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور نادور جس کا اپنا باپ پتا نہیں کیسا تھا لیکن وہ اب یعنی حق نواز کے نقش قدم

پر آنکھیں بند کر کے چل رہا تھا۔ ایک نشہ نہیں کرتا تھا باقی ساری عادتیں ان جیسی ہی تھیں۔

وہ اگر اس ماحول سے فرار کا سوچتی بھی تو ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے لیے سارے راستے

ہی بے نشان تھے۔ وہ کس پر پاؤں رکھتی۔ بالآخر اسی کو مقدر جان کر سمجھوتا کر چکی تھی۔ زیادہ سے

زیادہ ذہن اسی حد تک رسائی حاصل کرتا کہ کبھی نادور اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کر لے گا اور

اماں اس کی خواہش کے آگے سر جھکاتے ہوئے اسے اس کے پلے پاندھ دیں گی۔ اور رہنا تو پھر

بھی سہیں تھا۔

پھر وہ اس چار دیواری سے باہر کا کیا سوچتی۔ اس کی سوچیں اسی چار دیواری کے اندر رک

محدود رہیں۔ ہاں کبھی کبھی بھولے بھٹکے اسے فراز کا خیال آتا جو بچپن میں کہیں چلا گیا تھا۔ اور اس کے بارے میں بھی وہ زیادہ پرامید نہیں تھی۔ بس دعا کرتی وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔

اور آج وہ کچھ کتابیں لینے کی غرض سے بازار گئی تھی وہ اکیلی کبھی نہیں نکلتی تھی۔ نادور ہمیشہ اس کے ساتھ جاتا۔ آج بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔ لیکن واپسی میں اس کے کچھ دوست مل گئے تو وہ اسے

اشاپ پر چھوڑ کر خود دوستوں کے ساتھ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور پھر بارش نے بھی

گھیر لیا۔ پھر حسام کی آمد اور اس کے ساتھ بیٹھ کر آتا۔ یہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا ورنہ اس نے تو

کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ بھی رونما ہو جائے گا۔ گو کہ یہ کوئی غیر

معمولی بات نہیں تھی لیکن اس کے لیے بہر حال غیر معمولی تھی۔

رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو خاصی ڈسٹرب ہو چکی تھی۔ سوچیں منتشر ہوئیں اور دل

راہ فرار ڈھونڈنے لگا۔ اس کا وجہہ سراپا نگاہوں میں سماتے ہی اس کا شائستہ لہجہ کانوں میں رس

گھولنے لگا۔

”ارے.....! آپ بول بھی سکتی ہیں۔“

”میں حسام ہوں اور آپ.....!“

کب کسی نے اسے آپ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہاں تو تو تراخ سے بات ہوتی تھی۔ اور اکثر

گالیوں کے ساتھ۔ اور اس نے اس سے ہٹ کر کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب جو کسی نے راستہ چلتے

یوں عزت دے ڈالی تو وہ اپنے آپ میں معتبر ہونے لگی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب وہ

اسے سوچتے سوچتے ہی سوئی تھی۔ اور شاید زندگی میں پہلی بار کسی خوبصورت خواب نے اس کی

آنکھوں کا راستہ دیکھا تھا۔

شاید رات دیر سے سونے کا نتیجہ تھا کہ صبح معمول کے مطابق اس کی آنکھ نہ کھل سکی۔ ایک دو

بار اماں نے آواز دی تو وہ کسمسا کر دوبارہ سو گئی۔

”اے رجو.....! دیکھ اس کم بخت کو ابھی کہ نہیں۔“ اماں کا مخصوص لہجہ شروع ہو گیا اور آواز

اتنی اونچی تھی کہ وہ پوری طرح بیدار ہو گئی۔

”کیا ہوا.....؟ اماں کیوں چلا رہی ہو.....؟ نادور کی آنکھ کھلی تو وہ جھنجھلا کر پوچھنے لگا۔

”اس نامراد کو دیکھو۔ کل بارش میں بھٹکتی ہوئی آئی ہے۔ کہیں مر مرنا تو نہیں گئی۔“

اماں نے کہا تو اسے بارش میں بھٹکنا یاد آیا اور جوڑا سی حرکت کی تو جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔

”کون.....؟ کس کی بات کر رہی ہوں اماں.....؟“ نادور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”رابعہ کو دیکھو..... کل تم ہی اسے لے کر گئے تھے۔“

”کیوں..... کیا ہوا اے.....؟“

”ابھی تک پڑی سو رہی ہے۔“

”تو کیا ہوا..... سونے دے۔“ وہ لا پرواہی سے کہتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا۔

”بڑے آرام سے کہہ رہا ہے سونے دے۔ یہاں ناشتا کیا تیرا باپ بنائے گا۔“

اماں بڑبڑاتی ہوئی اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں اور اسے آنکھیں کھولے دیکھ کر حیرت اور غصے سے کہنے لگیں۔

”تو جاگ رہی ہے پھر بھی میری آواز نہیں آئی۔“

”اماں.....! مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کیوں.....؟“

”بدن ڈکھ رہا ہے۔“

”بارش میں بھیکے گی تو دکھے گا نہیں۔ چل اٹھ ابھی بچے اٹھ کر ہنگامہ مچا دیں گے۔“ وہ دم

صادر کر کے چلتی بنیں اور اسے ناچار اٹھنا پڑا۔

کوئی آس نہیں بندھی تھی۔ نہ ہی امید کی کوئی کرن دل میں جگمگاتی تھی لیکن ایک اجنبی کچھ وقت کو ہمسفر ہو کے اس کے خوابوں میں رنگ بھر گیا تھا۔ اور خواب رنگین کیا ہوئے کچھ مثبت سوچوں نے بھی ذہن میں جگہ بنانی شروع کی۔

کسے خبر کیا ہو جائے۔

کوئی معجزہ.....

کوئی حادثہ.....

شاید قسمت مہربان ہو جائے۔

شاید وقت کا عالم بچہ کہیں راستے سے پلٹ جائے۔ وہ بہت ساری باتیں فرض کرنے لگی تھی۔ اور غیر ارادی طور پر کسی ایک بات کے ہو جانے کی منتظر بھی تھی۔

آہٹوں پہ چونکنا۔ بیٹھے بیٹھے کھوجانا۔ اپنی کیفیت سے خود پریشان تھی۔ کہیں کوئی انداز اس کا اندر عیاں نہ کر دے۔ اور جو کسی کو خبر ہوگئی تو زندگی تنگ ہو جائے گی۔ اس وقت بھی روٹی پکاتے ہوئے اس کا ذہن گزرے کل میں الجھا ہوا تھا۔ جب نادر باورچی خانے کی چوکھٹ پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”کیا سوچ رہی ہو کناری.....؟“ وہ ایک دم حقیقت کی دنیا میں آگئی۔ کل تک وہ اس انداز اور اس لہجے کی عادی تھی لیکن اب اس سے برداشت نہیں ہوا۔ فوراً ٹوک دیا۔

”مجھے کناری مت کہا کرو۔“

”کیوں.....؟“ وہ ہنسا..... عجیب سی ہنسی۔

”اچھا نہیں لگتا۔“

”پھر کیا اچھا لگتا ہے تجھے.....؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ طویل سانس لے کر اس نے بات ختم کرنی چاہی۔

”میں بھی نہیں۔“ وہ یوں بولا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ فوراً کہہ دے گی کہ تم اچھے لگتے ہو لیکن

وہ خاموش رہی۔

”بیاناں.....! اپنے تئیں محبت سے اصرار کرنے لگا۔ وہ رخ موڑ کر ابا کے لیے چائے بنانے

لگی۔

”شرمارہی ہے۔“ وہ واقعی یہی سمجھ رہا تھا۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ دل چاہا

بھاگ کر کہیں دور چلی جائے۔ جہاں اس کی بے باک نظریں نہ ہوں اور نہ ایسا لہجہ سننے کو ملے۔

”تم کل مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے.....؟“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ مقصد ایسی

باتوں کی طرف سے اس کا دھیان ہٹانا تھا۔

”کچھ یا دوست مل گئے تھے۔“

”انہیں ٹالا بھی جاسکتا تھا یا پھر پہلے مجھے گھر چھوڑ دیتے پھر ان کے پاس جاتے۔“

”اچھا سارا غصہ اسی بات کا ہے۔“ وہ ہنسا اور وہ اس کی سمجھ پر حیران ہوئی۔ ”چل معاف کر

دے آئندہ تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”میرے خدا.....!“ اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ بمشکل ضبط کرتی ہوئی ابا کا ناشتا لے

کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”راستہ..... دو میں ابا کو ناشتا دے آؤں۔“ وہ چوکھٹ پر مزید ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گیا۔

”نادر بھائی.....! چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”تو میں کیا کروں.....؟“

”راستہ چھوڑو.....“

”دل پر پاؤں رکھ کر نکل جا.....“ وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے بولا اور اسی موقعے سے

فائدہ اٹھا کر وہ نکل آئی۔

ابا اپنے مخصوص کونے میں بیٹھے تھے۔ اس نے چائے کا پیالہ اور روٹی کی پلیٹ ان کے

سامنے رکھ دی۔

”ابا.....! ناشتا کر لیں۔“ اس نے انہیں متوجہ کیا تو وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ گو کہ وہ ان نظروں کی عادی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے مخاطب کرنے پر اسی طرح دیکھا کرتے تھے لیکن اس وقت کیونکہ دل بوجھل ہو رہا تھا اس لئے وہ آزرہ ہو گئی۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں ابا.....؟“

”تو کیوں میرا خیال رکھتی ہے.....؟“

”میں خیال نہیں رکھوں گی تو کون رکھے گا۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی لہجے میں آنسوؤں کی نمی بھی شامل تھی۔

”جب میں نے تم لوگوں کا خیال نہیں رکھا تو تم بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”میں آپ سادول کہاں سے لاؤں ابا۔ اور پھر میرے لیے ایک آپ ہی تو ہیں۔“

اس کے آنسو روانی سے بہہ نکلے جنہیں وہ جلدی سے دوپٹے کے پلو میں جذب کرنے لگی۔

”رابعہ، وہیں چپک گئی ہے کیا.....؟“ اماں نے شور مچانا شروع کر دیا تو وہ ابا کو ناشتا کرنے

کا کہہ کر ان کے پاس سے اٹھ آئی۔

”کیا سازش کر رہی تھی ابا کے ساتھ۔“ اماں مشکوک انداز سے بولیں۔

”ابا سے کیا سازش کروں گی۔ انہیں تو اپنا ہی ہوش نہیں ہے۔“ اس نے سوچا اور جلدی

جلدی چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے ناشتا بنانے لگی۔

پھر اگلے دو دن وہ اپنے آپ کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی کہ جو زندگی وہ گزار رہی ہے، وہی اس کا

مقرر ہے اور اس سے فرار کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ لیکن حسام کا خیال اتنا زور آور تھا کہ وہ اپنے

آپ کو سمجھانے میں ناکام ہو گئی۔

شاید کوئی حادثہ، کوئی معجزہ..... اسے ایک بار پھر میرے مقابل لاکھڑا کرے۔ دل نے اسی

خیال پر گرفت مضبوط رکھی اور اس نے دل کے آگے ہار مان لی۔

○ ○ ○

کل تک وہ بازاروں کے چکر لگا کر عاجز آچکا تھا لیکن اب وہ بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ بار بار

بے جی سے پوچھتا اور کوئی کام کوئی چیز نہ ملتی ہو تو میں ابھی لادیتا ہوں اور بے جی تو وہ ماں تھیں جو

ایک نظر دیکھ کر ہی اولاد کے اندر کا حال جان لیا کرتی تھیں۔

”کیا بات ہے.....؟ کل تک تو جان چھڑا رہے تھے۔ اب بازار میں کیا کشش پیدا ہو گئی

ہے۔“

”سکش.....؟ کیسی کشش.....؟“ وہ بوکھلایا۔

”پھر بازار کیوں جانا چاہ رہے ہو جبکہ دکانداروں کی نظروں میں مشتبہ بھی ٹھہر چکے ہو۔“ بے

جی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بھی تھی۔

”سمال کرتی ہیں آپ بے جی.....! ایک تو میں اپنی خدمات پیش کر رہا ہوں اوپر سے آپ

مجھ پر شک بھی کر رہی ہیں۔“

دل میں چور تھا جیسی وہ خواہ مخواہ جھنجھالنے لگا۔ اور بے جی قبل از وقت بات کرنے کی عادی

نہیں تھیں اس لیے اس بات کو یہیں ختم کرتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔

”جواب نہیں بے جی کا.....؟“ اس نے سوچتے ہوئے سروٹنے کی پشت سے نکا دیا۔

عجیب بے کلی سی تھی اور اضطراب۔ ساتھ ہی کچھ کھودینے کا لطیف سا احساس جسے وہ کوئی نام

نہیں دے پا رہا تھا۔ لیکن یہ یقین کامل تھا کہ منزل وہی تھی جسے وہ بچ چوراہے میں اتار آیا تھا۔

”رابعہ حق نواز.....!“ سینکڑوں بار اس نام کو دہرا چکا تھا لیکن ہونٹوں کی تھکنی تھی کہ بڑھتی ہی

جاری تھی۔

”وہ یقیناً مزنگ میں رہتی ہے۔“ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا اور کبھی وہاں سے

گزرتے ہوئے اس سے دوبارہ سامنا ہو سکتا ہے۔ اور پھر کبھی کیوں..... ابھی کیوں نہیں۔ اس

نے سوچا۔ فیصلہ کیا اور اٹھ کر چل پڑا۔ لیکن ابھی کمرے سے نکلا ہی تھا کہ بے جی نے بلا لیا۔ وہ

کندھے اچکا تا ان کے پیچھے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ بابا بھی موجود تھے۔

”تم فارغ ہو.....؟ بابا اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔“

”جی.....!“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔

”میرے دوستوں کے یہ کارڈز رہ گئے ہیں۔ اگر تم انہیں پہنچانے کا کام کر سکو تو۔“ بابا کی

عادت تھی۔ وہ کام بھی کہتے تھے اور اسے کرنے نہ کرنے کا اختیار بھی دوسرے کو سونپ دیتے تھے۔

”کیوں نہیں بابا.....! میں ضرور پہنچا دوں گا بلکہ ابھی چلا جاتا ہوں۔“ اس نے کارڈز بابا

کے ہاتھ سے لیے اور اسی وقت باہر نکل آیا۔

پھر پہلے اس نے تمام کارڈز مطلوبہ لوگوں تک پہنچائے اس کے بعد واپسی میں وہ مزنگ سے

ہوتا ہوا آیا، گو کہ اسے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ دوبارہ نظر آئے گی لیکن محض دل کے کہنے پر وہ

ادھر سے گزرا تھا۔

پھر چند دن احتشام بھائی کی شادی میں گزر گئے اور مزید چند دن زندگی کے معمول میں

آنے میں لگے۔ اور جب سب اپنی پرانی روٹین پر چلنے لگے تب اسے رابعہ کا خیال آیا۔ اور اس

سے دوبارہ ملنے کی خواہش دل میں سرابھارنے لگی۔ وہ کوئی ایسا رنگین مزاج یا دل پھینک قسم کا بندہ نہیں تھا۔

شروع سے کوئیکیشن میں پڑھتا آیا تھا اور اب بھی میڈیکل کالج میں لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑھ رہا تھا۔ لیکن کبھی کسی لڑکی نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا جتنا کہ وہ کرگئی تھی کچھ وقت ہی اس کی ہم سفری میں کٹا تھا اور وہ بھٹکی کی ہمسفری کی تمنا کر رہا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں مارا مارا تو نہیں پھر رہا تھا۔ بس اتنا تھا کہ اس نے اپنا راستہ وہی بنا لیا تھا۔ جہاں اسے چھوڑا تھا۔ کالج سے واپسی پر وہ اس راستے سے آتا۔ اور وہاں سے گزرتے ہوئے گاڑی کی اسپید آپ ہی آپ ہلکی ہو جاتی اور نظریں زاویہ بدلتی چلی جاتی تھیں۔ لیکن وہ وہاں کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ وہ مایوس تو نہیں ہوا تھا بس تھوڑا سا ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اور ڈسٹربنس کے بعد جب جھنجھلاہٹ کا مقام آنے لگا تو وہ نظر آگئی۔ وہاں نہیں جہاں وہ اسے تلاش کیا کرتا تھا۔ بلکہ وہ اسے ایک کالج کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اور اسے کالج کے سامنے کھڑی دیکھ کر یاد آیا کہ صبح بھی آج کل بی۔ اے کا ایگزام دے رہی ہے۔ اس نے گاڑی بالکل اس کے قریب جا روکی۔ وہ کیونکہ مخالف سمت دیکھ رہی تھی اس لیے متوجہ نہیں ہوئی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ پکار لے یا اس کے خود ہی متوجہ ہونے کا انتظار کر لے لیکن اب انتظار مشکل تھا۔ اس کی طرف کا شیشہ اتارتے ہوئے اس نے بے اختیار پکار لیا۔

”رابعہ.....!“

”رابعہ.....!“ اس کے پکارنے پر وہ چونک کر پلٹی اور اس پر نظر پڑی تو کتنی دیر تک حیران اور گرم صدم کھڑی رہ گئی۔ اس لیے کچھ دیر پہلے وہ کسی دوسرے پر اسی کا گمان کر کے تو جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی اور وہ یہاں موجود تھا۔ اس کے سامنے اس کے قریب ہی۔ حیرت سے نکل کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے۔ دروازہ بھی کھول دیا۔

”اس دن کے بعد میرا بیشتر وقت آپ کو ڈھونڈنے میں گزر رہا ہے۔“

”شاید آپ نروس ہو رہی ہیں۔“ وہ کن اکھیوں سے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا جن کی انگلیاں ایک دوسرے میں پناہ گزیں ہونے کے باوجود ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں۔

”جی!“ وہ آواز کی لرزش پر بھی قابو نہ پاسکی۔

”پھر کیسے ہو رہے ہیں.....؟“ وہ اسے نارمل کرنے کی غرض سے بولا۔

”فیک ہو رہے ہیں۔“

”اس کے بعد کیا ارادہ ہے.....؟“

”کچھ کہ نہیں سکتی۔“ پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود بات

کرے اور کتنی دیر تک وہ منتظر رہا اور وہ کیا بات کرتی یہی بہت بڑی بات تھی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی۔ گو کہ اندر ہی اندر بہت خوفزدہ تھی۔ دیکھ لیے جانے کا ڈر جس کا ہلکا سا عکس اس کے چہرے پر بھی جھلک رہا تھا۔

”رابعہ.....! کچھ کہیں ناں.....!“ بالآخر اسے کہنا پڑا۔

”سک..... کیا.....؟“ وہ اپنے خیال سے چونکی۔ ”کیا کہوں.....؟“

”چلیے یہ بتائیں، آئندہ ملاقات کب ہوگی.....؟“

”شاید کبھی نہیں۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی اور اس کا پاؤں ایک دم بریک پر

چلا گیا۔ گاڑی سائڈ میں روکتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ.....؟“ وہ بے تابی سے پوچھنے لگا اور وہ رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

”رابعہ.....! ادھر دیکھیں میری طرف۔“ وہ اس کی طرف پلٹی تو آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

”کیا آپ خود دوبارہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں.....؟“ وہ خاموش رہی۔

”کوئی برا بھلا ہے.....؟“ پھر خاموشی۔

”کہیں الجھجھ ہیں.....؟“

”نہیں.....“

”پھر.....!“

”بس میں نہیں مل سکوں گی۔“

”آخر کیوں.....!“ اس کا اصرار بڑھا اور وہ رونے لگی۔

”رابعہ پلیز.....! وہ پریشان ہو گیا۔ ”اس طرح مت روئیں مجھے بتائیں کیا بات ہے؟“

وہ کیسے کہے، میں حالات کا شکار مجبور لڑکی ہوں۔ خودداری آڑے آئی اور وہ آنسو پونچھ کر خاموش ہو گئی۔

”تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے رابعہ گزشتہ چند دنوں میں، میں نے صرف تمہیں سوچا ہے۔“

وہ آپ سے تم پر آیا تو اپنے رجحانوں کا احوال سہولت سے کہہ سنایا۔ اس کا دل چاہا وہ بھی کہہ سنائے۔

وہ سارے خواب جو جاگتی آنکھوں نے دیکھے۔ وہ ساری باتیں جو اس کے حوالے سے

سوچیں۔ وہ دل کی بے قراریاں۔ نیند کو ترسی آنکھیں۔ اور کسی مہجرے کے رونما ہونے کی

دعا کریں۔ لیکن وہ کیسے کہے۔ کہیں وقت کا ظالم بچہ ان لمحوں کو ہی نہ دیو بج لے جو زار راہ کے طور پر

اس کی جھولی میں آن گرے تھے۔

”رابعہ.....! کوئی آس تو دلاؤ۔“ اس نے گاڑی پھر سائڈ میں روک لی۔

”آس.....!“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ سوچنے لگی۔ میں تو خود کبھی اس کے دیے روشن نہ کر سکی پھر تمہیں کیا آس دلاؤں۔

”رابعہ.....!“ وہ اس کی پرسوج آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہارا خیال میرے لبو کے ساتھ گردش کرنے لگا ہے۔ میں اسے کسی طور مٹا نہیں سکتا۔ تم میری اذیتیں تمنا ہو اور میں.....“

اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ کسی نے آکر رابعہ کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔ رابعہ کی آنکھوں میں وحشت اتری۔ اور بدن خوف سے کاٹنے لگا۔

”اُلوی بیٹی، کون ہے یہ تیرا.....“ اس کا لہجہ انتہائی گھٹیا اور آواز اونچی تھی۔

”رابعہ کون ہے یہ.....؟“ حسام پوچھنے لگا۔ وہ کیا جواب دیتی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکی۔

”چلتی ہے یا.....؟“

اُف اتنی بے عزتی..... وہ جلدی سے اس کی طرف مڑ گئی۔ اس کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے حسام نے سوچا کہ وہ اتر کر معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرے لیکن اس سے پہلے ہی نادر اسے گھینٹا ہوا ٹیکسی میں جا بیٹھا دوسرے ہی لمحے ٹیکسی روانہ ہو گئی اور وہ کتنی دیر تک وہیں رکا، دور جاتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب وہ چونکا اور کچھ دیر بعد جب سوچنے بجھنے کے قابل ہوا تو احساس ہوا کہ یہ سب جو اچانک ہو گیا۔ وہ کچھ اچھا نہیں ہوا اور وہ کیوں بزدلوں کی طرح بیٹھا رہا۔ کیوں نہ بڑھ کر اسے روک لیا۔ اس کے ساتھ پشیمانی اور کھودینے کے احساس نے اسے آزرہ کر دیا۔

○ ○ ○

نادر کی گرفت اب بھی اس کی کلائی پر سخت تھی اور وہ اسے اسی طرح گھینٹتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔

”ابا.....!“ ڈوبتے کو تھکے کا سہارا کے مصداق وہ اس بے حس وجود کو پکار گئی۔ اس کی آواز میں جانے کیا تھا کہ گھٹنوں سے سر اٹھا کر ابا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”ابا.....!“ نادر نے غصے سے اس کی نقل اتاری اور اندر لے جا کر اماں کے سامنے بیٹھ دیا۔

”کیا ہوا.....؟“ اماں ناگواری سے پوچھنے لگیں۔

”اس آوارہ سے پوچھ کس یار کے ساتھ بیٹھی تھی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر اونچا کیا اور خود ہی پوچھنے لگا۔

”بتا کون تھا.....؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”نہیں.....“ اس کے منہ سے سسکی کی صورت میں آواز نکل گئی۔

”بتا ورنہ تیری بھی ٹانگیں توڑ کے ایک کونے میں ڈال دوں گا۔“

”میں نہیں جانتی۔“ وہ رونے لگی۔

”نہیں جانتی۔“ نادر نے اس کے بالوں کو جھٹکا دینے کے ساتھ منہ پر تھپڑ بھی دے مارا۔

”ایک گھنٹے سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جس طرح وہ اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس سے تو لگتا ہے کہ تو بہت عرصے سے اسے جانتی ہے۔“

”نہیں..... میں بالکل نہیں جانتی۔“ اس کا انکار نادر کو مزید طیش دلا گیا اور وہ ہاتھ چلانے لگا۔

”کیا کرتے ہو۔“ اماں نے بمشکل اسے روکا۔ ”اور اب کیوں مارتے ہو، تمہیں ہی شوق تھا

اسے پڑھانے کا۔ ورنہ میں تو پہلے دن سے خلاف تھی۔“

”مجھے کیا پتا تھا کہ یہ، یہ گل کھلائے گی۔ شکل سے تو اتنی میسنی لگتی ہے۔“

”اندر سے کھنی ہے مکار۔“ اماں کو موقع مل گیا۔

”اس کی ساری مکاری تو میں نکالوں گا۔“ اس نے پھر مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ لیکن اماں نے روک دیا۔

”ہاتھ روک کے..... پرانی لڑکی ہے۔“

”پرانی ہے۔ ابھی میرے ساتھ نکاح پڑھوادو پھر اپنی ہو جائے گی تو۔۔۔“

”نہیں.....“ وہ چیخی۔

”کیا نہیں.....؟“ وہ اسے اونچی آواز میں چیخا پھر اماں سے کہنے لگا۔

”اماں.....! بس جلدی سے انتظام کرو۔ اس کی بوری کے پر نکلنے لگے ہیں۔“

”اچھا.....! اچھا.....!“ اماں نے ٹالنا چاہا۔

”ٹالو مت اماں.....! آج ہی انتظام کرو۔“

”پاگل ہو گیا ہے کیا..... اتنی جلدی کیسے انتظام کروں۔“

”بس قاضی ہی کو تو بلانا ہے، ابھی بلا لاتا ہوں۔“

”جگ ہنسائی کرائے گا کیا.....؟ دو چار دن صبر کر۔“

”اس سے زیادہ نہیں۔“ اس نے کہا اور پھر اسے اٹھا کر اس اسٹور میں لے گیا جہاں اس کا بوریا بستر تھا۔

”خبردار.....! اب یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ.....!“ دھمکی دیتا ہوا وہاں پلٹ گیا اور وہ فرش پر بچھے گدے پر گئی اور اپنی بلند ہوتی سسکیوں کو دبانے کی خاطر ٹیکے میں منہ چھپا لیا۔ آنسو کی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ جتنا آنکھیں رگڑتی۔ بہے چلے جاتے۔ ایک سیلاب تھا، جس پر بند باندھنے کی اس کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔

کوئی شفیق آغوش جو میرے وجود کو اپنی پناہوں میں لے لے۔ کوئی مہربان کا ندھا جس پر سر رکھوں تو آنکھوں سے بہتا سیلاب ختم جائے۔

اس کا تڑپتا مچلتا دل صدائیں دینے لگا۔ ابا.....! ابا.....! اگر جو کوئی حس زندہ ہوتی تو اس کی بے آواز صدائیں بھی رنگ لاتیں لیکن وہ تو ہر احساس سے عاری تھے۔

”امی.....! امی.....!“ اسے امی (مہر النساء) بے طرح یاد آئیں اور احساس محرومی شدت سے تڑپانے لگا۔ وہ محل محل کر روتی رہی۔ کوئی آنسو پونچھے نہیں آیا۔ دوپہر ڈھلی تو اماں نے وہیں سے لپکار کر کہا۔

”ارے.....! کب تک پڑی رہو گی، اٹھ کر کھانے کی فکر کرو۔“ اس کا دل چاہا صاف منع کر دے یا اس آواز پر کان ہی نہ دھرے لیکن اتنی ہمت کہاں سے لاتی۔ چپ چاپ نکل کر کچن میں چلی گئی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سوج گئی تھیں، سر الگ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ چولہے کے سامنے کھڑی ہوئی تو آگ کی تپش براہ راست آنکھوں پر اثر انداز ہونے لگی۔ کاش اتنا حق اسے بھی ہوتا جو وہ کہتی تھی۔ یہاں نہیں کھڑا ہوا جا رہا۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں لیکن سارے حقوق تو امی کے ساتھ ہی دفن ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے سالن پکایا اور ابھی روٹی پکانی شروع ہی کی تھی کہ تار آگیا۔ وہ اس کے سر پر آکھڑا ہوا تھا اور ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں کٹنے لگی۔ اندر ہی اندر ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں وہ پھر حسام کے بارے میں نہ پوچھنا شروع کر دے اور وہ سارے ستم سہہ سکتی تھی، لیکن حسام کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی۔

”میں نے تجھے اسٹور سے نکلنے کو منع کیا تھا۔“ کافی دیر تک اس کا جائزہ لینے کے بعد کہنے لگا۔

”اماں نے روٹی پکانے کو کہا ہے۔“ وہ مری مری آواز میں بولی۔

”اماں تو ایسی ایسی ہی ہے۔ کم از کم یہ دو دن تو تجھے آرام کرنے دے۔“ وہ ایک دم سراسخا کر

اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ ایک آنکھ بند کرتے ہوئے بولا۔

”خیر.....! کوئی بات نہیں، شادی کے بعد میں تجھے کچھ آرام دے دوں گا۔“

اس کے دل میں لہری اٹھی جسے دبانے کی کوشش میں اس نے پچھلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

”کیوں بڑی تکلیف ہو رہی ہے.....؟“ وہ سنگدلی سے بولا۔ وہ کیا کہتی، بالکل غیر محسوس

طریقے سے اس کی طرف سے رخ موڑ گئی، پھر روٹی پکاتے ہی اس نے حسب معمول سب سے پہلے ابا کے سامنے کھانا لے جا کر رکھا۔

”ابا.....! کھانا کھالیں۔“ سر جھکائے ہوئے اس نے کہا۔

”راہبہ.....!“ ابا کا ہاتھ اس کے سر پر آٹھرا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

شاید کوئی معجزہ یا حادثہ کچھ تو تھا جو ابا کے گرد بنا بے حسی کا جال ٹوٹا نظر آ رہا تھا۔

”ابا.....!“ سر پر سائبان کا احساس ہوا تو آنکھیں ایک بار پھر جل تھل ہو گئیں۔

”رومت.....!“ ابا نے اس کے سر کو ہلکے ہلکے تھپکا۔ اب شفیق آغوش بھی تھی اور مہربان

کا ندھا بھی۔ گو کہ اماں اور پھر تار کے ڈر سے وہ نہ شفیق آغوش میں چھپ سکتی تھی اور نہ مہربان

کا ندھے پر سر رکھ کر رو سکتی تھی، پھر بھی یہ احساس ہی بہت تھا کہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ اسے

میسر آگئی تھیں۔ جیسی پلکوں کو ذرا سا جھپکا اور سیلاب ختم گیا۔

”تیری اماں اور تار کہاں ہے.....؟“ ابا نے سرگوشی میں پوچھا۔

”اندر ہیں۔“ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”سن میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ مجبور ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ

تیری طرف بڑھتے ہاتھ کو روک سکوں۔“ وہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔

”میں تیرا باپ ہوں پھر بھی تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے نکل جا۔“

”ابا.....!“ وہ سہم کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”ڈرمت.....!“ میری بات غور سے سن میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہے

کہ خضر حیات اور صالحہ بیگم گلبرگ میں رہتے ہیں اور خضر حیات کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ گلبرگ

میں کسی سے بھی اس کا پتا معلوم کر لینا۔“

”میں کیا کہوں ان سے.....؟“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، صالحہ بیگم سے صرف اتنا کہنا کہ تو مہر النساء کی بیٹی ہے اور

بس!“

”صالحہ بیگم.....!“ اس نے دہرایا اور اچانک ذہن کہیں پیچھے سفر کرنے لگا۔

”رابعہ.....!“ ابا نے فوراً اسے جھنجھوڑا۔ ”اس سے پہلے کہ کوئی باہر نکلے تو چلی جا۔“
 ”لیکن ابا.....!“ اب ابا کو چھوڑ کر جانے پر دل آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔
 ”میں کہتا ہوں جا، ورنہ یہ لوگ تیری زندگی کو عذاب بنا دیں گے۔“

اس نے جھک کر ابا کے ہاتھوں کو ہونٹوں اور پھر آنکھوں سے لگایا اور طویل سانس لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

○ ○ ○

شام میں وہ یونہی بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ذہنی طور پر وہ بہت اُپ سیٹ تھا۔ رہ کر رابعہ کا خیال آتا اور وہ شخص جو شکل سے ہی اوباش نظر آتا تھا، جب اس کے سامنے اسے گھٹیا لہجے میں بات کر رہا تھا تو گھر لے جا کر تو جانے کیا سلوک کیا ہوگا۔ وہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ رابعہ سے اس کا کیا ناتا ہوگا۔ بہر حال اسے زیادہ فکر رابعہ کی طرف سے تھی۔ ان چند دنوں میں وہ اسے اتنی عزیز ہو گئی تھی اور اتنی اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچنا چاہتا تھا اگر اسے اس کے گھر کا پتا ہوتا تو شاید وہ وہاں تک جانے کا رسک بھی لے لیتا۔ کئی بار اس نے گاڑی مزنگ کے راستے پر ڈالی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بھی چکرایا لیکن ہر بار مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

کیا کرے اور کیا نہ کرے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

شام گہری ہو کر رات میں بدل رہی تھی۔ وہ ذہن کو پرسکون کرنے کی خاطر ایک اوپن ایریا میں آ بیٹھا۔ تازہ ہوانے دل و دماغ کے بوجھل پن کو قدرے دور کیا تو وہ نئے سرے سے آج کے واقعے کو سوچنے لگا۔ لیکن آخر میں پھر ذہن الجھ گیا اور ان الجھی سوچوں کو سلجھاتے سلجھاتے بہت دیر ہو گئی۔ وہ تو اچانک اس کی نظر کھائی میں بندھی گھڑی پر پڑی تھی۔

نوجہنے میں بس چند ہی منٹ تھے اور بے جی کا حکم تھا نوجہ سے پہلے سب کو گھر میں موجود ہونا چاہیے۔

وہ ساری سوچیں جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی غلٹ میں گاڑی تک آیا بے جی کی فحاشی کا خیال ہر خیال پر حاوی ہو گیا تھا، اس لیے اس نے گاڑی فل اسپینڈ پر چھوڑ دی۔ ساتھ ساتھ گھڑی بھی دیکھنا جا رہا تھا۔

دائیں ہاتھ کو مزتے ہوئے اس نے بس ایک لمبے گھڑی کی طرف دیکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دیکھتے ہی وہ ہلکا سا گھبرا گیا۔ جانے کون اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا گو کہ اس

نے فوری طور پر بریک پر پاؤں رکھا تھا پھر بھی حادثہ ہو چکا تھا۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا، وہ گاڑی بھگا لے جائے لیکن سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ نیچے اتر کر دیکھا، وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس نے قریب جا کر اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا تو جہاں آنکھوں میں ڈھیروں حیرت سمی وہاں ہونٹوں نے حرکت کی۔

”رابعہ.....!“ اس کا گال تھپکتے ہوئے پکارا، پھر نبض پر ہاتھ رکھا۔ شاید بے ہوش تھی۔ جیب سے رومال نکال کر پیشانی سے بہتا خون صاف کیا۔

”ہاسپٹل لے جاؤں۔“ اس نے سوچا پھر فوراً ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔

”یہ کام تو میں خود بھی کر سکتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اسے بازوؤں پر اٹھا کر کچھلی سیٹ پر لٹایا اور خود جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا بے جی ہاتھ میں تسبیح لیے برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کیونکہ اس وقت اس کی پوزیشن بڑی خراب تھی۔ ایک ٹولیت دوسرے بازوؤں پر لڑکی، وہ بھی خوبصورت سی۔ بڑی مشکل سے وہ برآمدے کی چار سیڑھیاں چڑھ سکا۔ بے جی، اس وقت شہلتی ہوئی برآمدے کی آخری حد پر چلی گئی تھیں۔ وہاں سے پلٹیں تو اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔

صورت حال واقعی خاصی نازک تھی۔ دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ رابعہ سمیت اس میں سما جائے۔

”کون ہے یہ.....؟“ چند قدم آگے آ کر بے جی نے نہایت سرد لہجے میں پوچھا۔

”وہ بے جی.....! یہ.....“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

”کون ہے.....؟“ بے جی کا انداز ایسا تھا جیسے جتنا رہی ہوں کہ وہ سوال دہرانے کی عادی نہیں ہیں۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

”پھر.....؟“

”یہ اچانک میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔“ دل قابو میں آیا تو وہ تفصیل بتانے لگا۔

”خفی ہے.....؟“ اس کی پوری بات سننے کے بعد پوچھنے لگیں۔

”آؤ میرے ساتھ.....“ وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ بے جی اسے لے کر نالہ کے کمرے میں آ گئیں اور بیڈ پر لٹانے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً اسے لٹا دیا اور نالہ کی آنکھوں میں ابھرتے سوال نظر انداز کرتے ہوئے اسے فرسٹ ایڈ باکس لانے کے لیے کہا۔

ایک سال کے عرصے میں وہ ڈاکٹر بننے جا رہا تھا لیکن اس وقت بے جی کی موجودگی میں اس کی بینڈ بن کر رہے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے، جسے بے جی بھی صاف طور پر محسوس کر رہی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ طویل سانس لیتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”یہ بے ہوش کیوں ہے؟“ بے جی کی نظریں رابعہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

”خوف سے.....“

”کیا مطلب.....؟“

”اچانک حادثے سے خوفزدہ ہوئی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے۔“

”کوئی اور بات.....؟“ بے جی نے آہستہ سے دہرایا اور اچانک ان کے ذہن میں جھپکا سا ہوا۔ وہی نقش، وہی رنگ و روپ، جیسے مہر النساء سامنے آ گئی ہو۔

”اسے فوراً ہوش میں لاؤ۔“ بے جی کے لہجے میں بے تابی چھلک آئی۔ اس نے نائلہ کو اشارہ کیا تو وہ انجکشن تیار کرنے لگی..... اور جب وہ اسے انجکشن لگا کر ہٹا تو بے جی نے اسے باہر جانے کے لیے کہا۔

وہ جانا نہیں چاہتا تھا، لیکن بے جی کا حکم تھا، اس لیے دل پر جبر کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

”بے جی.....! آپ بیٹھ جائیں۔“

نائلہ نے کرسی گھسیٹ کر بید کے قریب کر دی بے جی بیٹھ گئیں تو اس نے بھی دوسری کرسی سنبھال لی۔ بے جی خاموشی سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگیں اور نائلہ کبھی کن اکھیوں سے بے جی کی طرف دیکھتی اور کبھی اس کی نظریں رابعہ کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں۔

اس کی لرزتی پلکیں دیکھ کر نائلہ نے بے جی کو متوجہ کیا۔

”میرا خیال ہے، اسے ہوش آ رہا ہے۔“

”ہوں.....!“ کہہ کر بے جی بغور اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس کی پلکیں ذرا سی کھلیں اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد نظریں بے جی پر ٹھہر گئیں۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟“ بے جی کے نرم لہجے پر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور ہونٹ ہنسنے لگیں کہ چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”ارے.....! تم رونے لگیں۔“ بے جی اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کے پاس جا بیٹھیں پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے بولیں۔

”رومت بیٹا.....! مجھے بتاؤ تم کون ہو.....؟“ وہ چپ چاپ روتی رہی۔

”تمہارا گھر کہاں ہے.....؟“ کوئی جواب نہیں آیا تو وہ نائلہ سے کہنے لگیں۔

”جاؤ، دودھ اور اوٹین ملا کر لے آؤ۔“ نائلہ فوراً چلی گئی اور کچھ دیر بعد ہی دودھ لے کر آ گئی۔

”اٹھو..... یہ پی لو۔“ بے جی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا لیکن اس نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

”پی لو..... جلدی اچھی ہو جاؤ گی۔“

”مجھے اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بے جی نے اسے رونے دیا، بس بہت آہستگی سے اس کی کندھا تھمکتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی۔ تب انہوں نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے خاموشی سے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”کیا نام ہے تمہارا.....؟“ اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

”رابعہ.....! بے جی نے نام یوں دہرایا جیسے اسے پکار رہی ہوں۔

”جی.....!“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”پورا نام بتاؤ۔“

”رابعہ حق نواز۔“

بے جی چونکیں تو اسے دیکھ کر ہی تھیں اور اب تو کسی شے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

”تم مہر النساء کی بیٹی ہونا.....؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی

بے جی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

”تمہارے گھر اطلاع کرو اور تمہیں کہہ دو.....!“

”نہیں بیگم صاحبہ.....! میں گھر نہیں جاؤں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”پھر.....؟“

”مجھے کہیں اور جانا ہے۔“

”کہاں.....؟“

”خضر حیات صاحب کے گھر.....“ وہ کچھ دیر رک کر پوچھنے لگی۔ ”آپ جانتی ہیں خضر حیات کو۔“

”ہاں.....!“ بے جی ہلکے سے مسکرائیں۔

”پھر اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے ان کے گھر پہنچا دیں۔“ وہ منت سے بولی۔

”تم خضر حیات ہی کے گھر میں ہو۔“ بے جی نے کہا تو وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھتے

ہوئے بس اتنا کہہ سکی۔

”آپ.....؟“

”ہاں میں صابر ہوں۔“ بے جی نے اس کا سراپے کندھے سے لگا لیا۔

اور وہ تو کب سے کسی مہربان کا ندھے پر سر رکھنا چاہ رہی تھی بے اختیار روٹی چلی گئی۔

”بس کرو بیٹا.....! بہت رو چکیں۔“ اس کے سر اور کمر کو تھکتے ہوئے بے جی نے بڑی

مشکل سے اسے چپ کرایا پھر کہنے لگیں۔

”ایک بات بتاؤ.....! ابھی اتفاقاً تمہارے ساتھ حادثہ ہوا ہے یا تم خود جان بوجھ کر گاڑی

کے سامنے آئی تھیں.....؟“

”ہاں نہیں بیگم صاحبہ.....! میں شاید آپ کا گھر تلاش کرتے کرتے تھک گئی تھی، پھر بھی میرا

خیال ہے، میرا خود سے گاڑی کے سامنے آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”اچھا.....!“ بے جی کھل کر مسکرائیں۔ ”اور یہ تم مجھے بیگم صاحبہ کیوں کہہ رہی ہو.....؟“

وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم مجھے بے جی کہہ سکتی ہو، جیسا کہ میرے بچے کہتے ہیں۔“ پھر انہوں نے نائلہ کو بلایا اور

وہ جو بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی کہ کسی طرح بے جی اسے بھی اپنی باتوں میں شامل کریں۔ فوراً

آگے بڑھا آئی۔

”نائلہ.....! یہ رابعہ ہے۔“ بے جی تعارف کروانے کے بعد کہنے لگیں۔ ”شروع میں جب

ہم پاکستان آئے تھے تو کچھ عرصہ ہم نے اس کی دادی کے گھر قیام کیا تھا اور وہیں ہماری شادی

ہوئی تھی۔ بہت نیک خاتون تھیں اس کی دادی بے چاری کے نصیب میں شاید کچھ نہیں تھا۔ ایک ہی

بیٹا اور وہ بھی۔“ بے جی خاموش ہو گئیں پھر کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگیں۔

”اب کیسے ہیں تمہارے والد.....؟“

”ویسے ہی ہیں۔“

”اور ہاں تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا.....؟“

”اپانے.....“

اس کے مختصر جواب پر بے جی اس کی طرف یوں دیکھنے لگیں، جیسے پوچھنا چاہتی ہوں، کس

کام سے۔

وہ ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر سوچنے لگی کہ انہیں کیسے بتائے کہ وہ کن حالات سے گزر کر

یہاں تک آئی ہے اور یہ کہ اس کے حالات سن کر پتا نہیں، بے جی اس کی کوئی مدد کر بھی سکیں گی یا

نہیں۔ اسے سوچتے دیکھ کر بے جی جانے کیا سمجھیں۔ نائلہ سے کہنے لگیں۔

”نائلہ.....! تم ذرا صبیحہ کے کمرے میں چلی جاؤ۔“ نائلہ بھی شاید یہی سمجھی کہ وہ اس کی

موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتی اس لیے چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔

”ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے.....؟“

بے جی اتنے اعتماد سے بولیں جیسے انہیں یقین ہو کہ اب وہ کوئی بات نہیں چھپائے گی اور ان

کا یقین غلط نہیں تھا۔ اس نے آنسوؤں کے درمیان اپنی ساری پٹا کہہ سنائی۔

بے جی ایک ماں بھی تھیں، حساس دل بھی رکھتی تھیں۔ بظاہر ہر بات سکون سے سنتی رہیں

لیکن دل جیسے خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو کتنی دیر تک بے جی تسلی کا ایک لفظ

تک نہ کہہ سکیں۔

”کیا آپ میری کوئی مدد کریں گی.....؟“ وہ یہ بات پوچھ رہی تھی جس کی دادی کے احسان

کا بوجھ بے جی اب تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہی تھیں۔ اور پھر مہر النساء نے کہا تھا۔

”اگر آپ اماں کے احسان کا بدلہ اتارنا ہی چاہتی ہیں تو ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے

کہ یہ انہیں کی اولاد ہیں۔“

”بے جی.....!“ انہیں سوچتے دیکھ کر اس نے ڈرتے ڈرتے پکارا تو بے جی چونک کر اس کی

طرف دیکھنے لگیں۔

اس کی آنکھوں میں آس و نراس کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں اور شاید اندر کے خوف کا ہلکا سا

عکس بھی چہرے پر جھلک رہا تھا کہ اگر بے جی نے پناہ نہ دی تو وہ کہاں جائے گی۔

”بیٹا.....!“ بے جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں تو بہت پہلے تمہیں اپنے ساتھ لانا

چاہتی تھی لیکن تمہاری اماں نے آنے نہیں دیا اور اب جب تم آئی گئی ہو تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔“

تدریجاً توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”اس وقت رات زیادہ ہو گئی ہے، صبح میں خود تمہارے والد کے پاس جاؤں گی۔“

”آپ.....!“ وہ پتا نہیں کیا پوچھنا چاہتی تھی۔

”ہاں میں.....“ اس کے ساتھ ہی بے جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”اب تم آرام سے لیٹو، دل پر

کسی قسم کا بوجھ مت ڈالو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نائلہ کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں۔“

بے جی اسے تسلی دیتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ برآمدے میں حسام اور نائلہ سر جوڑے

بیٹھے تھے۔ یقیناً۔ ان کا موضوع رابعہ تھی۔ بے جی کو دیکھ کر دونوں فوراً سیدھے ہو گئے۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں.....؟“ وہ حسام سے پوچھنے لگیں۔ ”بس ابھی جا رہی تھا۔“

”چلو جاؤ۔“ بے جی نے اپنے سامنے اسے کمرے میں بھیجا پھر نالکہ سے کہنے لگیں۔
”رابعہ.....! تمہارے ہی کمرے میں سوئے گی، اس کا خیال رکھنا۔“

”جی.....!“ نالکہ فو اٹھ کھڑی ہوئی تو بے جی اسے کچھ ہدایات دے کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

خضر حیات صوفے پر بیٹھے کچھ کاغذات دیکھنے میں مصروف تھے۔ آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

بے جی انہیں رابعہ کے بارے میں بتانا چاہتی تھیں، اس لیے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔

○ ○ ○

صبح سب معمول کے مطابق اٹھے اور پھر ناشتے کی ٹیبل پر بے جی نے سب کو چونکا دیا۔
”میں نے حسام کی شادی طے کر دی ہے، اسی جمعہ بارات جائے گی۔“

جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور سب سوالیہ نظروں سے بے جی کی طرف دیکھنے لگے۔
ہونٹ ہلانے کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ خضر حیات اپنی اولاد کو کم صدم دیکھ کر خامے بھڑو ہوئے اور ان کے ہونٹوں کی دبی دبی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر احتشام کہنے لگے۔

”بے جی.....! یہ بیٹھے بٹھائے حسام کی شادی کا کیسے سوچ لیا آپ نے اور وہ بھی بول آنا فنا.....؟“

”مجھے ایک لڑکی اچانک پسند آگئی اور وہ جس طرح اچانک پسند آئی، اسی طرح میں نے اچانک حسام کی بات بھی طے کر دی۔“

”بات طے کر دی، یہ تو اچھی بات ہے لیکن فوری شادی والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ ابھی حسام کی تعلیم۔“

خضر حیات بات ادھوری چھوڑ کر بے جی کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ رات انہوں نے رابعہ کے بارے میں بتایا تو تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کی حسام سے شادی بھی کرنا چاہتی ہیں۔
”تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔“ بے جی فوراً بولیں۔ ”ہاں اگر آپ کو میرے اس فیصلے سے اختلاف ہو تو بتا دیجیے۔“

”اختلاف.....“ خضر مسکرائے۔ ”اختلاف ہی تو نہیں ہے آپ بہتر سوچ سکتی ہیں۔“
”بے جی.....! اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی بتائیں حسام کی شادی کہاں کر رہی

جی.....؟“
”اس لڑکی کا نام رابعہ ہے، رابعہ حق نواز۔“
”ارے.....!“ وہ حیران ہوا۔

وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا، لیکن اس رخ پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔
اس کے سینے میں خوشگوار دھڑکنوں کا ارتعاش پیدا ہو گیا۔ منزل اتنی قریب آگئی تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر چومسکتا تھا۔ کل تک وہ کس قدر پریشان تھا، اس کے لیے اور اس کا حصول ناممکن نظر آ رہا تھا۔

اور اب.....

دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ بے جی اور بابا دونوں اٹھ کر جا رہے تھے، پھر ان کے جاتے ہی کمرے کی خاموش فضا میں ایک دم ہلچل مچ گئی۔

”کمال کر دیا بے جی نے۔ مجھے واقعی بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ نالکہ بے پناہ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ وہ رات بھر میں اس کے تمام حالات اسی کی زبانی سن چکی تھی اور اسے اس پیاری سی لڑکی رابعہ سے ہمدردی کے ساتھ ساتھ اپنائیت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

”خوشی کی بات تو ہے لیکن اچانک سب کیسے ہو گیا.....؟“ صائمہ بھابی پوچھنے لگیں۔

”قصہ کچھ یوں ہے۔“ نالکہ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا پھر رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا لیکن رابعہ کے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ وہ بے جی کی کسی عزیز مرحومہ دوست کی بیٹی ہے اور اتفاقاً حسام سے نکرا کر اس گھر تک آ پہنچی ہے۔ اس نے رابعہ کے حالات یوں نہیں بتائے کہ.....
بے جی نے صبح ہی اس کے کمرے میں آ کر اسے منع کر دیا تھا۔

”کیا وہ اب بھی تمہارے کمرے میں موجود ہے۔“ صبیحہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔
”ہاں.....!“

”میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں۔“ صبیحہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھی تو نالکہ نے اسے روک دیا۔

”ابھی مت جاؤ۔ میرا خیال ہے، بے جی اور بابا دونوں اسی کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ خواہ خواہ ڈانٹ پڑ جائے گی۔“

”یہ تو ہے۔“ صبیحہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ ”ویسے رات میں ہم کہاں تھے.....؟“
”تم سب اپنے اپنے کمروں میں تھے اور تھی تو میں بھی اپنے کمرے میں لیکن اتفاق سے بے جی اسے میرے کمرے میں لے آئیں۔“
”کیسی ہے.....؟“ صبیحہ کا اشتیاق کم نہیں ہو رہا تھا۔

”بہت پیاری ہے، ویسے حسام سے پوچھو۔“ اور وہ جو جانے کن سوچوں میں گم تھا اپنے نام پر چونک کر سب کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”ہاں بھئی..... تم کہو۔“ احتشام بھائی کے مسکرانے پر وہ جھینپ کر سر کھجانے لگا۔

”بے چارہ برا بھنسا۔“ صائمہ بھابی تاسف کا اظہار کرنے لگیں۔ اصل میں انہیں یہ سارا قصہ پسند ہی نہیں آیا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس گھر میں اپنی بہن کو لانا چاہتی تھیں اور دوسری بہت عام سی لڑکی ان کے برابر درجہ حاصل کرنے آرہی تھی۔

”برائیں، اچھا بھنسا۔“ نائلہ فوراً بولی۔ ”آپ راجہ کو دیکھیں گی تو میری بات کی تائید کریں گی۔“

”مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا، چلیں نائلہ باجی! میں اسے دیکھوں گی۔“

صبیحہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آئیے صائمہ بھابی! آپ بھی چلیں۔“

”چلو.....!“ صائمہ بھابی انھیں تو نائلہ کو بھی اٹھنا پڑا، لیکن تینوں جیسے ہی ڈرائنگ روم سے نکلیں انہوں نے بے جی، بابا اور ان کے ساتھ راجہ کو برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کی طرف جاتے دیکھا۔

”یہ سب کہاں جا رہے ہیں.....؟“ نائلہ نے کہا۔ صائمہ بھابی نے کندھے اچکائے جبکہ صبیحہ اچک اچک کر راجہ کو دیکھنے کی کوشش کرتی رہی اور اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہ منہ پھلائے ہوئے دوبارہ کمرے میں آگئی۔

”ارے تمہیں کیا ہوا.....؟“ احتشام بھائی اس کے پھولے پھولے چہرے کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”بے جی اگر ہمیں دکھا دیتیں تو کیا ہوتا۔“

”کیا انہوں نے ڈانٹ دیا.....؟“

”نہیں.....“

”پھر.....؟“

”وہ اور بابا، راجہ کو لے کر چلے گئے ہیں۔“

”کہاں.....؟“ حسام چونک کر پوچھنے لگا۔

”پتا نہیں..... ہم نے بس انہیں جاتے دیکھا ہے۔“

وہ تو فحاشی سے کہہ کر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے پیچھے احتشام بھائی بھی چلے گئے جبکہ وہ کتنی دیگر ننگ و ہیں بیٹھا سوچتا اور ابھار ہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اٹھ کر نائلہ کے کمرے کی طرف

پل پڑا۔

نائلہ سے دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ راجہ کے بارے میں جاننے آیا ہے پھر بھی انجان بن گئی۔

”تم آج کالج نہیں جاؤ گے.....؟“ سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”جاؤں گا لیکن ذرا دیر سے..... اور تم.....!“

”میں آج چھٹی کروں گی۔“

”اچھا.....!“ وہ اطمینان سے بیڈ پر ٹانگیں سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر

بظاہر اپرواہی سے پوچھنے لگا۔

”یہ بے جی کہاں گئی ہیں.....؟“

”صرف بے جی تو نہیں۔“ وہ اس کے انداز پر شرارت سے ہنس پڑی۔

”جب جان ہی گئی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں تو بتا دو۔“

”کیا بتاؤں.....؟“

”بہی کہ کون ہے اور کیا واقعی وہ بے جی کی کسی دوست کی بیٹی ہے.....؟“

”ہاں.....! وہ بے جی کی دوست کی بیٹی ہے۔“

”اور وہ رات کے وقت اکیلی کہاں جا رہی تھی، جو میری گاڑی سے آنکرائی۔“

”وہ ہمارے ہی گھر آرہی تھی۔“

”کیا.....؟“ وہ متعجب ہوا پھر جھنجھلا کر کہنے لگا۔ ”اصل بات بتاؤ کیا ہے.....؟“

”اصل میں اس کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور بے جی نے مجھے منع کیا ہے کہ کسی سے

ذکر نہ کروں۔“

”کیوں.....؟“

”کیونکہ وہ اس کے ساتھ تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں اور شاید ان کے پیش نظر یہ

بات ہے کہ ہو سکتا ہے اس کے حالات جان کر تم ان کے فیصلے سے اختلاف کرو۔“

”میں کیسے اختلاف کر سکتا ہوں جبکہ میں خود بہت پہلے ہی اس سے شادی کا فیصلہ کر چکا

ہوں۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور نائلہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بہت پہلے سے کیا مطلب.....؟ کب سے جانتے ہو راجہ کو.....؟“

”میں..... میں کہاں جانتا ہوں اسے.....؟“ وہ بوکھلا گیا۔

”ٹھیک ہے پھر میں بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔“

”مت بتاؤ۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے، شادی ہو جائے گی تو میں خود ہی اس سے پوچھ لوں

گا۔ وہ اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہو کر ہنسنے لگا۔
 ”میں تمہاری شادی ہونے دوں گی تب ناں۔۔۔۔۔“
 ”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”جے جی سے کہہ دوں گی کہ تمہیں رابعہ پسند نہیں آئی اور تم کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے اور یہ بھی کہ تم اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتے ہو۔“
 وہ اتنی سنجیدگی سے بولی کہ وہ ایک ہی جست میں بیڈ سے اچھل کر اس کے مقابل آکر اڑا ہوا۔

”خبردار۔۔۔۔۔! تم نے ایسی کوئی بات کی۔“
 ”تو پھر سیدھی طرح بتاؤ۔“ اسے ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ بھی اس کے بارے میں بتائے گی۔

○ ○ ○

نادر، اماں کے پاس سے اٹھ کر کچن میں آیا، وہ رابعہ سے کھانے کا کہنے آیا تھا لیکن وہ کچن میں موجود نہیں تھی۔ وہ اپنے پاؤں اس کے اسٹور نما کمرے میں گیا اور وہاں نہ پا کر وہیں سے ادھنی آواز میں پوچھتا ہوا آیا۔

”یہ رابعہ کہاں چلی گئی، کھانا نہیں دے گی کیا۔۔۔۔۔ اماں! رابعہ کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”وہیں اندر ہی کہیں مری ہوگی۔“ اماں نے وہیں سے جواب دیا۔
 ”یہاں تو نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور نظریں اس کونے میں جا بھٹکیں، جہاں ابا آرام سے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ وہ ان کے پاس چلا آیا۔

”رابعہ کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”ہنا نہیں، ابھی تو مجھے کھانا دے کر گئی ہے۔“ ابا نے اپنا لالعلقی کا انداز اپنائے رکھا۔
 ”کہاں جائے گی، اندر ہی ہوگی۔“
 ”اندر نہیں ہے۔“

”پھر مجھے نہیں پتا۔“ ابا نے قیص کے دامن سے ہاتھ صاف کیے اور خالی برتن اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔ ”لو یہ لیتے جاؤ۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ چیخا اور برتنوں کو اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ وہ آنگن میں جا گرے۔
 ”سیدھی طرح بتاؤ، رابعہ کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ ابا کو اس کی بدتمیزی پر غصہ آ ہی چکا تھا اور غصے

میں انسان آپے میں نہیں رہتا۔
 انہوں نے بھی نتیجہ کی پرواہ کیے بغیر کہہ دیا۔
 ”رابعہ کو میں نے بھیج دیا ہے۔“
 ”کہاں۔۔۔۔۔؟“ وہ اتنی زور سے چیخا کہ اماں گھبرا کر باہر نکل آئیں۔
 ”کیا ہوا نادر۔۔۔۔۔! کیوں چلا رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”اس سے پوچھو، کہہ رہا ہے میں نے رابعہ کو بھگا دیا ہے۔“
 ”کس کے ساتھ۔۔۔۔۔؟“ اماں کے منہ سے بے اختیار نکلا، پھر وہ قریب آتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”کیا ہوا حق نواز۔۔۔۔۔! کہاں بھیج دیا رابعہ کو۔۔۔۔۔؟“

”وہ میری بیٹی ہے اور میں نے جہاں مناسب سمجھا ہے اسے بھیج دیا ہے۔ تم لوگوں کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ابا کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ اماں چیخ پڑیں۔
 ”اب وہ تمہاری بیٹی ہو گئی ہے اور جو میں نے پال پوس کر بڑا کیا تو میرا کوئی حق ہی نہیں رہا۔ کس دھڑلے سے کہہ رہے ہو کہ ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ارے لوگ تو مجھ پر نام دھریں گے۔ سوتیلی ماں تھی نکال کر باہر کیا ہوگا۔ ہائے میں کس کس کو جواب دوں گی۔“ اماں نے منہ پر دوپٹہ رکھ کر رون شروع کر دیا۔

حق نواز تو دو بارہ بے حسی کی چادر اوڑھ ہی چکے تھے۔ اس لیے ان پر اماں کے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوا جبکہ نادر، ماں کو روتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اماں۔۔۔۔۔! روؤ مت۔ میں ابھی نکل کر دیکھتا ہوں زیادہ دُور نہیں گئی ہوگی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر دو تین گھنٹے کی تلاش کے بعد جب وہ ناکام لوٹا تو اس کا غصہ تو انتہا کو پہنچ ہی چکا تھا۔ ناکامی نے اسے جنونی بھی بنا دیا تھا۔ بقیہ تمام رات نہ وہ خود سو یا نہ ابا کو سونے دیا وقتے وقتے سے انہیں جھنجھوڑ کر پوچھتا رہا۔ کہاں بھیج دیا اسے اور ابا کو بھی شاید ضد چڑھ گئی تھی بتا کے نہیں دیا۔

پھر جب ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اماں اور نادر سر جوڑ کر بیٹھے تو اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ بادلِ خواست اٹھ کر گیا اور دروازے پر رابعہ کو دیکھ کر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر صالِح بیگم اور خضر حیات پر پڑی۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں دب کر اپنی بات روکی اور دروازے سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

”حق نواز کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ خضر حیات نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔ اور اس کے جواب دینے سے پہلے رابعہ انہیں لے کر ابا کی طرف بڑھ گئی۔

”ابا.....! یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ رابعہ نے ابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں متوجہ کیا۔ ابا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھے گئی پھر ان کی نظریں خضر حیات پر پڑیں۔

”آپ اسے یہاں کیوں لے آئے اگر آپ کے پاس جگہ نہیں تھی تو کہیں اور.....“

”یہ بات نہیں ہے حق نواز.....!“ بے جی ان کی بات کاٹ کر کہنے لگیں۔ ”میں تو بہت پہلے رابعہ کو لے جانا چاہتی تھی، لیکن..... خیر چھوڑو۔“ انہوں نے گئے وقتوں کی بات وہیں چھوڑ دی پھر کہنے لگیں۔ ”اب بھی میں اسے لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں۔“

”ہم اسے بہو بنا کر لے جانا چاہتے ہیں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو.....“

اور حق نواز کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا بھلا، وہ احساس ممنوعیت سے بے جی اور پھر خضر حیات کی طرف دیکھے گئے۔ جبکہ رابعہ، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بیگم صالحہ خضر حیات اس پر اتنی مہربان ہو جائیں گی کہ اسے اس طرح اپنے گھر لے جانے کی بات کرنے لگیں گی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اب وہ اس گھر سے فرار چاہتی تھی لیکن جس کی خاطر فرار کا سوچا تھا، وہ جانے کہاں تھا۔

”ہم اسی جمعہ کو بارات لے کر آئیں گے، تب تک رابعہ آپ کے پاس ہماری امانت ہے۔“

بے جی کہہ رہی تھیں اور وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے اسٹور نما کمرے میں آگئی پھر اس نے وہیں دروازے میں رک کر سنا۔ بے جی اس کی اماں اور نادر کو سمجھا رہی تھیں۔

”رابعہ اب ہماری امانت ہے اور ہم اس پر کسی قسم کی کوئی زیادتی برداشت نہیں کریں گے۔“

بے جی جانے سے پہلے ایک طرح سے وارننگ دے گئی تھیں۔

اب جب وقت مہربان ہو رہا تھا تو اس کے اندر بے جی بڑھتی جا رہی تھی پہلے شاید امید تھی کہ کبھی تو حسام اسے ڈھونڈتا ہو یا یہاں تک چلا آئے گا اور اب جبکہ بے جی اس کے جملہ حقوق اپنے بیٹے کے نام محفوظ کروا کے جا چکی تھیں تو اس کی آخری امید نے دم توڑ کر اسے بے کل کر دیا تھا۔

○ ○ ○

شام میں بے جی نے نائلہ، صبیحہ اور حسام کو بلا کر ایک طویل فہرست نائلہ کے ہاتھ میں تھا دی اور کہنے لگیں۔

”تم دونوں ہمیں حسام کے ساتھ چلی جاؤ۔“

”جی.....!“ نائلہ فہرست پر نظریں دوڑانے لگی۔

”ہرچیز اچھی اور دیکھ بھال کر لینا۔“

”بے جی.....! اگر صائمہ بھائی بھی ساتھ چلیں تو.....!“

”نہیں صائمہ آج کل باہر نکلنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور پھر وہ اس حالت میں تم لوگوں کے ساتھ کہاں ماری ماری پھرے گی۔ کوئی ایک چیز تو لینی نہیں ہے۔“

پھر حسام سے کہنے لگیں۔ ”تم بہنوں کے ساتھ رہنا اور ذرا خیال رکھنا۔“

”جی.....!“ اس نے سعادت مندی سے سر جھکا یا پھر بے جی سے لسٹ اور پیسے لے کر وہ تینوں باہر نکل آئے۔

”نائلہ.....!“ مین روڈ پر گاڑی لاتے ہی وہ کہنے لگا۔ ”رابعہ کا کچھ اتا پتا.....؟“

”ہاں.....! دوپہر میں، میں نے بے جی سے خاصی معلومات حاصل کی ہیں۔“

”پھر کیا خیال ہے، اسے بھی لے چلیں.....؟“

”بھائی! ہوش میں تو ہو، بے جی کو پتا چل گیا تو.....“

”کون بتائے گا انہیں، ہم تینوں تو ہرگز نہیں بتائیں گے۔“

”ہو سکتا ہے، اس کے گھر والے۔“ نائلہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”کچھ نہیں ہوتا آپنی.....! لے چلتے ہیں اسے بھی۔“ صبیحہ نے بھائی کی طرف داری کی۔

”اصل میں اس کا اپنا بہت دل چاہ رہا تھا کہ رابعہ کو دیکھے۔“

”میں یہیں اتر جاتا ہوں۔ تم اسے لے کر آ جاؤ۔“ اس نے فوراً تجویز پیش کی۔

”اتنی بھی بے صبری کیا ہے، تین چار دن کی تو بات ہے، پھر وہ آ ہی جائے گی۔“ نائلہ کو بے

جی کا زیادہ ڈر تھا۔

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”دیکھ تو چکے ہو۔“

”کہاں..... بے جی کی موجودگی میں ہمت ہی نہیں ہوئی۔“

”کیا.....؟ بے جی کی موجودگی میں اور جو پہلے.....؟“ نائلہ اس کا پول کھولنے جا رہی تھی کہ

اسے گھورتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔

”میں نے تو نہیں دیکھا۔“ اس نے گاڑی روک دی اور فوراً دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

”تم اسے کسی بھی بھانے لے آؤ، میں یہیں ملوں گا۔“ نائلہ مجبوراً ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی

پھر اسے ہاتھ ہلاتی ہوئی گاڑی آگے بڑھانے لگی اور وہ وہیں کھڑا رہ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے اپنی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور اس

انداز سے جیسے اتفاقاً یونہی سر راہ کھڑا ہو۔

”ارے حسام بھائی.....! آپ یہاں کہاں کھڑے ہیں۔“ نائلہ نے گاڑی اس کے قریب

رُکی اور صبیحہ شیشے سے سر باہر نکال کر یوں پوچھنے لگی، جیسے اس نے بھی اتفاقاً اسے دیکھ لیا ہو اور وہ جو اپنے خیال میں بیٹھی تھی، اس کے نام پر چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جسے وہ پورا دن سوچتے ہوئے ہلکان ہوتی رہی ہے وہ یوں اپنا سا بن کر سامنے آ کر کھڑا ہوا ہے۔

”یہ لڑکی کون ہے.....؟“ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ شرارت سے مسکرایا۔

”تم ہم سے زیادہ جانتے ہو گے۔“ نائلہ ہنسی۔

”نہیں بالکل نہیں جانتا۔“ اس نے نائلہ کو پیچھے بھیج کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور وہ اس کی قربت سے نزوس ہو کر چادر کو آگے تک کھینچ کر اپنے تئیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جبکہ اب وہ اسے سر میں دیکھ رہا تھا۔

پھر خریداری کے دوران وہ ہر چیز میں اس کی پسند پوچھتا رہا اور وہ حیرتوں کے سمندر سے نکلتی تو کچھ کہتی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وقت اس پر یوں بھی مہربان ہو جائے گا۔

”دیکھو.....! بعد میں مت کہنا کہ مجھے یہ سب پسند نہیں۔ اسی وقت مجھے سمیت ہر چیز کو اچھی طرح دیکھ لو۔“ وہ اس کی مسلسل خاموشی پر کہنے لگا تو نائلہ ہنس پڑی پھر کہنے لگی۔

”میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں، اسے ہر چیز پسند آئے گی سوائے تمہارے۔“

”کیا.....؟“ وہ قدم روک کر کھڑا ہو گیا۔

”زکوٰۃ، چلتے رہو۔“

”نہیں..... یہیں فیصلہ ہو جائے۔“ وہ اڑ گیا اور اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے

پوچھنے لگا۔

”بتاؤ.....! میں کیسا ہوں.....؟“ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے نائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیوں تنگ کرتے ہو بے چاری کو۔“ نائلہ نے اسے دھکا دے کر ہٹایا اور راجہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے چل پڑی۔

واپسی میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ راستے میں اتر گیا۔ پہلے نائلہ اسے گھر چھوڑ کر آئی اور پھر تینوں ساتھ اپنے گھر آ گئے۔

وہ بے حد مطمئن تھا اور خوش بھی اور سوچ رہا تھا کہ اس کی سگت میں باقی ماندہ حیات کا سفر خوبصورتی سے طے ہوگا۔

چوتھے دن وہ اپنے وجود کی تمام تر عنایتوں اور خوبصورتیوں سمیت اس کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ایک تنگ اسے دیکھے جا رہا تھا اور جہاں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چاروں پہلے تک اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی میں یہ خوبصورت موڑ اچانک در آئے گا۔ وہاں وہ بھی حیران تھی اور شاید اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں ناکام ہو رہی تھی کہ وہ عذاب زندگی سے نکل کر گلاب زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔

”رابعہ.....!“ اس نے پکارا اور اس کے قریب جا بیٹھا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پر شرمیلیں مسکراہٹ مچلی۔ اس کے برعکس خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں اس کے چہرے پر پھیلنے لگیں جنہیں محسوس کر کے اس نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

”کیا بات ہے، تم خوفزدہ ہو.....؟“ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ تو اس نے ایمانداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیوں.....؟“ اور اس کیوں کے جواب میں رو پڑی یہاں اس نے بے جی والا حربہ استعمال کیا۔ اسے رونے دیا۔ جب وہ خود ہی چپ ہو گئی تب کہنے لگا۔

”اب بتاؤ کیا بات ہے.....؟“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”مجھ سے.....!“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

”نہیں.....! اپنے مقدر سے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”مجھے خوشیاں رس نہیں آتیں۔ میں نے جب کبھی کسی چھوٹی سی خوشی کا تصور بھی کیا تو.....“

”رابعہ.....!“ اس نے ٹوک دیا۔ ”اب تمہیں میری ہمراہی میں ڈرنا نہیں چاہیے اور سنو.....! میری ہمنوا.....! تمہارے مقدر سے میں لڑوں گا اور اس سے چھوٹی چھوٹی نہیں بڑی بڑی خوشیاں چھین کر تمہارا دامن بھروں گا۔“

وہ ہلکی ہلکی ہلکی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”جو زندگی گزر گئی اچھی یا بری، اسے بھول جاؤ۔ اب صرف یہاں دیکھو، یہاں کے ہر فرد کو تم اپنے آپ سے محبت کرتا پاؤ گی۔“ پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنے لگا۔

”اور میں صرف جان دینے کی باتیں ہی نہیں کروں گا کبھی وقت آنے پر تم پر جان دے بھی دوں گا۔“

اس کی آنکھوں میں پھر نمی اترنے لگی۔

”اول ہوں.....! اب مت رونا۔“ وہ فوراً پلکیں جھپکنے لگی تو وہ ہنس پڑا۔

”گڈ.....! اب ڈرائس کر بھی دکھا دو، تاکہ میں سمجھوں کہ تم یہ کام بھی بخوبی کر سکتی ہو۔“
 بات کے اختتام پر اس نے اپنی ایک آنکھ بند کر لی اور وہ جو پوری آنکھیں کھولے اسے ہی دیکھ رہی تھی اس کی اس حرکت پر بری طرح جھینپ گئی۔
 رات اس نے صرف اس کی محبتیں دیکھی تھیں اور انہی کے لیے اسے اپنا دامن تنگ لگ رہا تھا اور صبح اتنی ڈھیر ساری محبتیں ایک ساتھ اس کی جھولی میں آن گئیں۔
 بابا، بے جی اور احتشام بھائی کی پر شفقت چاہتیں۔ بظاہر صائمہ بھابی بھی خوش تھیں اور پھر نانک، انعام اور صبیحہ کی پر خلوص محبت۔ وہ ایک ایک کی محبت اپنے دل کے نہاں خانوں میں سمیٹا لیتی گئی۔ کبھی جو وقت پہلو بد لے۔ (وہ اس وہم سے لگی نہیں تھی) تو وہ ان محبتوں کو آواز دے لے گی۔
 ویسے کے بعد بے جی نے اس نئے جوڑے کے تمام پروگرام کیمنٹل کروا دیے۔ یعنی ہنی مون اور ملنے ملانے والوں کے ہاں دعوتیں۔ سب کو بڑی سہولت سے منع کر دیا کیونکہ حسام کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔

”میں امتحانوں کے بعد ساری کسر نکال دوں گا۔“ وہ اس سے کہنے لگا۔
 ”میرے لیے یہی گھر جنت سے کم نہیں اور مجھے اس سے دور جانے کی آرزو بھی نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ دل میلالت کریں۔“ وہ پوری سچائی اور ایمانداری سے بولی تھی۔
 ان کی شادی کو ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ صائمہ بھابی نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ ایک عرصے بعد اس گھر میں بچے کی آمد ہوئی تھی۔ سب بے طرح خوش تھے اور بے جی کی خوشیوں کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ بچے کے ساتھ ساتھ صائمہ بھابی کے بھی وہ ناز اٹھائے کہ کسی کسی وقت تو صائمہ بھابی کو خود اپنے آپ پر رشک آنے لگتا تھا۔ چھٹی، چھلہ، سب بہت ڈھوم دھام سے کیا تھا۔ وہ جو ایک عمر زندگی کی جتنی دھوپ میں سفر کرنے کے بعد ٹھنڈی اور پرسکون چھاؤں میں آئی تھی، گو کہ بہت خوش تھی کہ اسے اس کی حیثیت اور سوچ سے بڑھ کر ملتا تھا لیکن ایک وہم جو ہمیشہ اس کے دل میں جاگزیں رہا کہ اسے خوشیاں راس نہیں آتیں، وہ اب بھی اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔

کہیں مجھ سے یہ سب چھن نہ جائے، یہ سب دھوکا نہ ہو، وقت نہ پہلو بدل جائے۔
 یہ سب باتیں اسے پریشان کر دیتیں اور اس خیال سے کہ کہیں کسی کی محبت میں فرق نہ آجائے، اس نے اپنے آپ کو سب کے لیے وقف کر دیا، سب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ضرورتوں کا یوں خیال رکھتی جیسے یہ خاص اس کی ذمہ داری ہو۔
 مگر جب حسام کا لچ جانے کے لیے تیار ہوتا تو وہ اس کی تیاری میں یوں مدد کرتی جیسے وہ کوئی

چھوٹا سا بچہ ہو، کئی بار اس نے جھنجھلا کر اس کے ہاتھوں سے اپنے جوتے چھینے تھے۔
 ”تم کیوں اٹھاتی ہو انہیں.....؟“
 ”تو کیا ہوا.....؟“ وہ سادگی سے بولی۔
 ”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”راہی.....! میری جان.....! تمہارے یہ ہاتھ جوتے اٹھانے کے لیے نہیں ہیں۔“ اتنی محبت اور یہ شہ آگہیں لہجہ۔ وہ ڈرنے لگتی، وقت کا کوئی ظالم پنجان لحوں کو دبوچ نہ لے۔
 سب کالج چلے جاتے تو وہ پہلے بے جی اور ان کے بعد صائمہ بھابی میں لگ جاتی، ان کے بچے رضا کے تیل کی مالش کرنا پھر منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلوانا، صائمہ بھابی حیرت سے پوچھتیں۔
 ”تم کیسے یہ سب کر لیتی ہو رابہ! مجھے تو اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔“
 ”ارے.....!“ وہ ہنستی پھر انہیں بتاتی کہ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو پال کر خاصی ایکپرٹ ہو چکی ہے۔

پھر ننھے رضا سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچن کا رخ کرتی، گو کہ خاناماں موجود تھا پھر بھی وہ خود کھانا پکانے میں ہاتھ بٹاتی، کبھی صرف اس کی مدد کرتی اور کبھی الگ سے کوئی چیز بنا لیتی تھی، بے جی کو اس کا سلیقہ اور گھرداری میں دلچسپی پسند تھی، وہ اسے سراہتیں اور نانکہ صبیحہ کو اس کی مثال دیتی تھیں۔

”بھابی.....! آپ تھکتی نہیں.....؟“ نانکہ، صبیحہ اسے گھیر لیتیں۔
 ”تھکنا کیسا.....؟“ وہ مسکراتی۔

”ذرا ذرا سے کام کے لیے خود اٹھ جاتی ہیں آخر یہ ملازم کس لیے ہیں۔“
 ”مجھے عادت ہے خود کام کرنے کی۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم از کم آپ ہمارے لیے تو نہ اٹھا کریں، ہمیں بہت شرمندگی ہوتی ہے۔“
 وہ سوچتی۔

”میں نے تو ایک عمر اس گھر کی خدمت میں گزاری ہے جس کے مکینوں نے کبھی مجھے اپنا سمجھا ہی نہیں اور جنہوں نے محبت تو کیا ہمدردی کا ایک بول کبھی نہیں بولا، اور یہاں جو محبتوں کا بہتا ساگر ہے جس سے میری روح تک سیراب ہوئی جاتی ہے تو کیا اس کے لیے میں اتنا بھی نہیں کر سکتی۔“

پھر وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے حسام کے امتحان شروع ہو گئے اور امتحان وہ دے رہا تھا پریشان وہ تھی۔ رات بہت دیر تک جب تک وہ اسٹڈی کرتا رہتا، وہ اس کے پیچھے چپ چاپ بیٹھی

رہتی اور جب محسوس کرتی کہ وہ تھکنے لگا ہے تو اس کے لیے چائے بنا کر لے آتی۔
 ”تم سوئیں نہیں.....؟“ وہ حیرت سے پوچھتا۔
 ”نیند نہیں آ رہی۔“ جب کہ آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی تھیں۔

”جاؤ سو جاؤ۔“

”ابھی نہیں جب آپ فارغ ہو جائیں گے تب۔“

”اور اگر میں رات بھر اسی طرح بیٹھا رہا تو.....؟“

”میں بھی بیٹھی رہوں گی۔“

”بے وقوف.....! چلو جا کر لیٹو۔“ وہ نہیں نہیں کرتی اور وہ زبردستی اسے بستر میں دھکیل دیتا۔

جس روز وہ آخری پیر دے کر آیا برآمدے میں کھڑے ہو کر اونچی آواز میں ”میں فارغ ہو گیا“ کے نعرے لگانے لگا۔

”حسام.....!“ بے جی نے آ کر اسے ٹوکا ”تم اب بچے نہیں ہو“

”ارے بے جی.....! اتنے دنوں سے ٹینشن میں تھا آج ریلیکس ہوا ہوں تو خوب شور

مچانے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”اپنے کمرے میں جاؤ حسام.....!“ بے جی کا ٹھہرا ہوا لہجہ۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ بچکانہ حرکتیں

پسند نہیں کریں گی سر جھکا کر اپنے کمرے میں آ گیا وہ ایک سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے میں

مصروف تھی۔

”کہیں جا رہی ہو.....؟ اس کے پوچھنے پر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی جس طرح وہ

حیران کھڑا تھا۔ اس سے وہ اسے ستانے پر آمادہ ہوئی، بنجیدگی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے بولی۔

”ہاں.....!“

”کہاں.....؟“

”کہیں بھی.....“

”کہیں بھی.....“ اس نے ڈہرایا پھر الجھ کر پوچھنے لگا ”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”آپ کی مصروفیت نے مجھے بور کر دیا ہے۔“

”لیکن اب تو میں فارغ ہو گیا ہوں۔“ وہ فوراً بولا۔

”تو پھر آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

”لیکن کہاں.....؟“

”یہاں.....“ اس نے ٹکٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے جنہیں وہ بے تاب سے دیکھنے

لگا۔ ”یہ کس نے دیں.....؟“

”بے جی نے۔“

”ارے.....!“ وہ بے طرح خوش ہوا۔ ”بے جی زندہ باد، کتنا خیال ہے انہیں ہمارا.....“

پھر ٹکٹ رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”اور تم کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

”کچھ نہیں.....“

”میری مصروفیت نے تمہیں بور کر دیا ہے۔“ وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ارادے خطرناک

تھے اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔

○ ○ ○

مری، سوات، کاغان ان سرسبز وادیوں میں اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے وہ سارے

اندیشوں کو پیچھے چھوڑ آئی اور قدرت جیسے اسے فیاضی سے نواز رہی تھی، وہ ابھی ان مسرتوں کو

سنبھال نہیں پاری تھی کہ ایک اور خوشی اس کی جھولی میں آن گری۔

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد وہ دونوں ہوٹل سے نکل کر یونہی ٹہلتے ہوئے کافی آگے

تک چلے گئے جب اچانک وہ چلتے چلتے رُکی اور سر جھٹکتے ہوئے پلکیں جھپک جھپک کر اس کی

طرف دیکھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا رابعہ.....!“ اسے کندھوں سے تھام کر وہ پریشانی سے پوچھنے لگا۔

”ہمتا نہیں میں بہت عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔“ پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے

بولی۔ ”مجھے پھر سے آرہے ہیں۔“

وہ فوراً اس کی آنکھوں کے پونے اٹھ کر کے دیکھنے لگا پھر نبض پر ہاتھ رکھا تو کچھ شبہ ہوا تو

نیکی روک کر اسی وقت اسے قریبی کلینک لے گیا جہاں اس کے شے کی تصدیق ہو گئی کہ وہ ماں

بننے والی ہے۔

”رابعہ.....! رابعہ.....! رابعہ.....!“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشی کا اظہار کس

طرح کرے، بس اسے پکارے چلا گیا اور اس نے ہنستے ہوئے چادر میں منہ چھپا لیا۔

وہ خود ڈاکٹر تھا، جانتا تھا کہ اب ان اونچے نیچے راستوں پر چلنا اس کے لیے نقصان دہ ہوگا

اور یہ کہ اس وقت اسے آرام کی ضرورت ہے اور مکمل آرام اسے گھر پر ہی میسر آ سکتا تھا۔ لہذا بچہ پروگرام کنسل کرتے ہوئے وہ اسے لے کر واپس آ گیا۔

”ہیں تم تو دو مہینے کا کہہ کر گئے تھے اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے۔“ بے جی کو اچنبھا ہوا۔

”اصل میں بے جی.....! رابعہ کی طبیعت.....“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا تو وہ جھینپ کر اندر چلی گئی کچھ دیر بعد بے جی اس کے پیچھے پیچھے آئیں شاید حسام نے انہیں بتا دیا تھا اس لیے ان کی ہدایات شروع ہو گئیں۔

”اب زیادہ بھاگ دوڑ مت کرنا، جتنا ہو سکے آرام کرو، کوئی بھاری چیز مت اٹھانا اور اگر ایسی ہی کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا، کھانا وقت سے کھاؤ اور کوئی خاص چیز کھانے کو دل چاہے تو۔“ وہ خاموشی سے سختی اور سر ہلاتی گئی۔

پھر جس نے سنا خوشی کا اظہار کیا، نائلہ اور صبیحہ خاص طور پر اس کی دلجوئی کرتیں اور فارغ وقت میں اس کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ حسام کا ہاؤس جاب شروع ہو چکا تھا، اس کے باوجود وہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتا تھا۔

”اتنی توجہ اتنی محبتیں.....“ وہ پھر ڈرنے لگی، وقت کا کوئی ظالم بچہ۔ ”میرے خدا! تو نے میری حیثیت سے بڑھ کر مجھے نوازا تو اے مالک! ان محبتوں کی شمعیں یونہی جلتی رکھنا، انہیں بجھنے نہ دینا، ہر دم اس کے لبوں پر یہ دعا مچلتی رہتی۔

وقت سبک رفتاری سے گزرنے لگا، ان دنوں اس کا دلکش سراپا خاصا بے ہنگم ہو رہا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتی، جب کہ ڈاکٹر نے اسے چہل قدمی کا مشورہ دیا تھا۔ حسام خود اس بات کو سمجھتا تھا اس لیے وہ اکثر رات کو بڑی سی چادر میں چھپائے اس کے سنگ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ کبھی دور نکل جاتی اور کبھی تھوڑا فاصلہ طے کر کے ہی تھک جاتی تھی، حسام اس کا خیال رکھتا وہ آگے تک جانا چاہتی تو وہ اسے دور تک لے جاتا اور اگر واپسی کے لیے کہتی تو وہ فوراً قدم موڑ لیتا ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی حالت میں عورت کے مزاج میں چڑچڑاہٹ اور کدکد آتا ہے، اس لیے وہ کوشش کرتا کہ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہونے دے، کسی کسی وقت تو وہ خود حیران ہو جاتی کہ وہ اس کی بعض ایسی باتیں بھی مان جاتا ہے جو اس کے خیال میں اسے نہیں ماننا چاہیے تھیں۔

صبح اس کی طبیعت خاصی بوجھل ہو رہی تھی، اصل میں رات وہ ابا سے ملنے چلی گئی تھی، ان کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی اس پر اماں، نادر کا سلوک ناقابل برداشت۔ وہ ان کی حالت پر کڑھتی رہی تھی اور اب بھی دل اور ذہن اس بوجھ سے آزاد نہیں ہوئے تھے، حسام ہسپتال جانے کے لیے

دیکھتی رہی۔ پھر کیا خیال آیا کہنے لگی۔

”حسام.....! آج آپ ہسپتال نہ جائیں۔“ وہ اس وقت ٹائی کی نائٹ لگا رہا تھا پلیٹ کر اس کی طرف دیکھا، جانے کیا تھا اس کے چہرے پر، اس نے ٹائی کھینچ کر ایک طرف ڈال دی اور اس کے پاس آتے ہوئے کہنے لگا۔

”جو حکم..... نہیں جاتا۔“ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے گئی، گندمی رنگت جو صبح کے اجالے میں سرخی مائل ہو رہی تھی، چوڑی پیشانی پر گھنے بال جھکے آرہے تھے اور خوبصورت ہونٹ جو اسے دیکھ کر ہر دم مسکرانے پر آمادہ رہتے تھے۔ اب بھی مسکراہٹ دبائے ہوئے تھے، اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جذبے لٹاتی ہوئیں جن میں پیار کا سا گر مچلتا تھا۔ وہ اس مچلتے سا گرمی میں ڈوبنے لگی۔

”یوں کیا دیکھ رہی ہو.....؟“ وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ارے رابعہ بیگم.....! ہمیں تو حسرت ہی ہے کہ کبھی تم بھی ہمیں تنگ کرو۔“ وہ خاموش رہتی تو وہ اس کی ٹھوڑی چھو کر پوچھنے لگا۔

”ہاں..... نہیں۔“ دونوں جواب ایک ساتھ وہ ہنس پڑا۔

”آؤ یہاں لیٹو..... میں تمہارا چیک آپ کروں۔“ اور اس کے ”نہیں نہیں“ کرنے کے باوجود اس نے زبردستی اسے لٹایا اور پھر بڑی سنجیدگی سے چیک اپ کرنے کے بعد جب سیدھا کھڑا ہوا تو کہنے لگا۔

”بس ایک ہفتہ، پھر اس مصیبت سے تمہیں چھٹکارا مل جائے گا۔“

”مصیبت نہ کہیں۔“ وہ فوراً بول اٹھی۔

”پھر کیا کہوں اس کی وجہ سے میں تمہاری ایک مسکراہٹ دیکھنے کو ترس گیا ہوں اتنی ڈل ہو گئی ہو کہ ہر وقت چہرے پر بیزاری چھائی رہتی ہے۔“ وہ خاموش ہو رہی۔

”خفا ہونے کی کوشش مت کرنا۔“

”میں بالکل خفا نہیں ہوں۔“ وہ اٹھ بیٹھی کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

”ڈرپ لگا دوں۔“

”نہیں، میں مسلسل لیٹے لیٹے تھک جاتی ہوں۔“

”اچھا تو یونہی گلو کو زپنی لو، ٹھہرو میں لے کر آتا ہوں۔“ وہ فوراً جا کر اس کے لیے ٹھنڈے پانی میں گلو کو زلا لایا جسے پینے کے بعد وہ پھر لیٹ گئی۔

دن بھر وہ اسے بہلاتا رہا اور اس کا دھیان بنانے کی خاطر اس نے پہلی بار اسے بے جی کے اداسے تنگ تپایا کہ تقسیم بند سے پہلے وہ کیا تھیں، وہ اس بارے میں لاعلم تھی، اس لیے حیران ہو کر

سنی رہی پھر دوپہر میں وہ بے جی کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی سو گئی تھی، شام میں اُٹھی تو اس سے کہنے لگا۔

”چلو میں تھوڑی تفریح کرادوں۔“

”رات میں چلیں گے شہلتے ہوئے۔“

”مجھے ایک بندے سے ملنا ہے تم بھی چلو فریش ہو جاؤ گی۔“ اسے سوچتے دیکھ کر کہنے لگا۔

”تم گاڑی میں بیٹھی رہنا۔“

”اچھا۔۔۔!“ اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور چادر لے کر اس کے ساتھ چل پڑی برآمدے میں بے جی مل گئیں۔ اس نے انہیں اپنے جانے کے بارے میں بتایا پھر اسے لے کر باہر نکل آیا۔

شام کی فرحت بخش ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو وہ قدرے سکون محسوس کرنے لگی۔

”ہاں ہے حسام۔۔۔!“ وہ کہنے لگی ”میں اس وقت سے بے جی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔!“ وہ اس کی بات میں دلچسپی ظاہر کرنے کی غرض سے اشتیاق سے بولا۔

”وہ اپنے گھر والوں کا ذکر نہیں کرتیں۔۔۔؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”زیادہ نہیں بلکہ ہمارے سامنے تو وہ گریز ہی کرتی ہیں شاید اس لیے کہ ان کے خیال میں کہیں ہم ان کی گزشتہ زندگی کو کریدنا نہ شروع کر دیں، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اپنے گزشتہ مذہب پر بات نہیں کرنا چاہتیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”اچھی بات تو ہے لیکن۔“

”لیکن یہ کہ ہمیں بے جی کی ایک بات پسند نہیں ہے۔“

”کون سی۔۔۔؟“

”بعض ہندو ازم رسوم کو وہ اب تک اسی طرح مانتی ہیں۔“

”مثلاً۔۔۔“

”مثلاً۔۔۔“ اس نے دہرایا اور سوچنے لگا کہ وضاحت کرے یا نہ کرے۔

”بتائیے ناں۔۔۔“ وہ واقعی جاننا چاہتی تھی وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

”بے جی راکھی کی اہمیت کو اسی طرح تسلیم کرتی ہیں حالانکہ ہمارے مذہب میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔“ پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگا ”ہو سکتا ہے ہم اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس راکھی کی بدولت بے جی، نانکہ اور ابرار کے درمیان دیوار بنی کھڑی ہیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”جب ہم چھوٹے تھے تو ایک بار یونہی کھیل ہی کھیل میں بے جی نے نانکہ کے ہاتھ سے

ابرار کی کلائی پر راکھی بندھوا دی تھی اور اب جب کہ نانکہ اور ابرار ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں

بلکہ ابرار کے ہاں سے شادی کا پیغام بھی آچکا ہے تو بے جی کسی طرح نہیں مان رہیں، ان کا کہنا ہے

کہ راکھی کے بندھن میں بندھنے کے بعد یہ دوسرا بندھن کسی طرح بھی ممکن نہیں۔“

”میرے خدا۔۔۔!“ وہ بے حد حیران ہوئی ”بابا اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتے۔“

”بابا نے کوشش تو کی ہے انہیں سمجھانے کی لیکن۔“ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے

گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔

”یہاں کہیں جانا ہے آپ کو۔۔۔؟“ وہ اسے گاڑی روکتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔!“ لیکن روڈ کے اس طرف وہاں پارکنگ کی جگہ نہیں ہے اس لیے میں نے یہاں

روک دی تم چلو گی یا۔“

”نہیں میں یہاں ٹھیک ہوں۔“

”اوکے۔۔۔ میں دس منٹ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ گاڑی سے اترا اور احتیاط سے روڈ

کراس کر کے دوسری طرف بنی عمارت میں چلا گیا۔

وہ نانکہ کے بارے میں سوچنے لگی، تو خیال آیا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے ابھی ابھی سی نظر آ

رہی تھی اسے نانکہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی اور اپنی غفلت پر پشیمانی کہ گھر میں رہتے ہوئے

بھی اس مسئلے سے بے خبر ہے لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا کسی نے اس کے سامنے ذکر ہی

نہیں کیا تھا پھر بھی وہ اپنے آپ کو الزام دینے لگی، گاڑی کی پشت سے سر نکالتے ہوئے اس کی

نظریں بھاگتی دوڑتی گاڑیوں پر جم گئیں، قریب ہی کسی گاڑی کے بریک بڑی زور سے چرچائے

تو اس نے چونک کر دیکھا اور جیسے اس کا سارا بدن سن ہو گیا، بلی کا چھوٹا سا بچہ پیسے کے نیچے کھلا گیا

تھا، گاڑی بس کچھ دیر کو رکی پھر آگے بڑھ گئی اور اس کے لیے اس منظر کو دیکھنا اور اسی منظر میں بیٹھنا

دوبار ہو گیا طبیعت پہلے ہی بوجھل تھی اور اب تو لگ رہا تھا اگر کچھ دیر اور یہاں بیٹھی تو چیخ چیخ کر رونا

شروع کر دے گی، دوسری طرف کا دروازہ کھول کر وہ نیچے اترتی اور یہ سوچے بغیر کہ حسام بس ابھی

آنے والا ہے اس کے پیچھے چل پڑی وہ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اور یہ ایک فطری بات

تھی کہ اب کچھ دنوں میں وہ خود ماں بننے والی تھی اس لیے ایک بلی کے بچے کی ناگہانی موت اس پر

الحد تک اثر انداز ہوئی کہ دل سہم کر رہ گیا تھا ہر طرف سے بیگانہ ہو کر اس نے مصروف شاہراہ پر

قدم رکھ دیئے اور جب وہ اس چوڑی سڑک کے درمیان میں تھی تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تیز رفتار میں اس کے سر پر پہنچ چکی تھیں، اس میں بھاگنے کی سکت نہیں تھی اور رکنا انتہائی خطرناک تھا۔

”شاید وقت کا خاتمہ ہی ہو گا۔“ اس نے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”رابعہ!“ چنچی چنگھاڑتی آوازوں میں سے یہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور پھر جیسے کسی نے اسے بڑی زور سے دھکا دیا، فٹ پاتھ پر گر گئے ہی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اسے وہکیل کر وہ خود اس تک آنے میں ناکام ہو گیا تھا۔

”حسام!“ اس کے حق سے دل دوزخ جیج نکلی اور سامنے خون کا دریا اس کی تمام حسں مغلوب کر گیا۔ اور اگلے ہی پل کائنات کے سارے اندھیرے ایک ساتھ اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

○ ○ ○

پورے پانچ دن بعد اسے ہوش آیا، وہ بھی اس طرح کہ صرف آنکھیں کھلیں ورنہ پورا جسم اور خاص طور سے ذہن جیسے گہری نیند میں تھا، چھت پر نظریں مرکوز کیے وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ سسر نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کر فوراً ڈاکٹر کو بلا لائی ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا اور چیک اپ کے دوران اس سے ہلکے پھلکے سوال کرتی رہی، وہ کچھ سنتی تو جواب دیتی اسے تو کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، پھر ڈاکٹر نس کو کچھ ہدایات دے کر چلی گئی تو وہ پھر تہارہ گئی۔

”مجھے کیا ہوا ہے.....؟“ آہستہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا..... اور حواس بھی لوٹنے لگے تب ایک سرگوشی جیسے کوئی قریب ہی کھڑا کہہ رہا ہو۔

”میں صرف جان دینے کی باتیں ہی نہیں کروں گا“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور نظریں زاویہ بدلتی ہوئی چاروں طرف بھٹکتے لگیں، درود یار کو چیرتی ہوئی آواز۔

”میں وقت آنے پر جان دے بھی دوں گا۔“ قریب تھا کہ وہ جیج پڑتی کہ بچے کے رونے کی آواز نے اس کی توجہ منجلی، اس نے چونک کر گردن موڑی اور کاٹ میں لیٹے بچے کو دیکھ کر اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے پیٹ پر چلا گیا۔

”ارے.....!“ وہ حیران ہوئی بے خبری میں وہ کتنے مراحل طے کر آئی تھی، بچے کو شاید بھوک لگی تھی، وہ مسلسل رونے جا رہا تھا اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں، چپ چاپ کتنے

آنکھوں کے کناروں سے نکل کر نیچے میں جذب ہونے لگے۔

”کوئی تو آئے۔“ اس کا دل شدت سے ایک ایک کو صدا دینے لگا اور پتا نہیں اس کی صدا سن گئی یا اوپر والے کو معصوم بچے کے رونے پر رحم آیا کہ دروازہ کھلا اور نائلہ آگئی، دروازہ کھلنے کی آواز پر ہی اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں اور نائلہ کو دیکھ کر اس کا دل درد سے پھٹنے لگا وہ جو اس پر جان لٹا گیا تھا، وہ صرف اسی کارفتی نہیں تھا اس لڑکی کا ماں جایا بھی تھا، نائلہ نے جلدی سے فیڈر بنا کر بچے کے منہ سے لگائی پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں مجرم ہوں، قاتل ہوں مجھے دار پر چڑھا دو۔“ اس کے ہونٹوں میں الفاظ ٹوٹنے لگے۔

”نہیں بھابی.....!“ نائلہ نے بڑھ کر اس کی پیشانی پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔

”شاید خدا کو یہی منظور تھا۔“ نائلہ نے کہا تو وہ سسکیوں سے رونے لگی ”آپ مت روئیں رونا آپ کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔“ وہ اور شدت سے رونے لگی۔

”بھابی پلیز.....!“ نائلہ اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”جب کوئی خوشی میری جھولی میں گرتی ہے، وہ اسے دبوچنے میں دیر نہیں کرتا۔“

نائلہ کیا کہتی خاموشی سے اس کا ہاتھ تھپکنے لگی۔

”بے جی کیسی ہیں.....؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ان کی حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتی ہیں وہ ماں ہیں سنبھلتے سنبھلتے ہی سنبھلیں گی۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”آپ ہم سب کی فکر نہ کریں اپنے آپ کو سنبھالیں اس بچے کی خاطر جسے حسام آپ کی جھولی میں ڈال گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی امانت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کریں گی۔“

اس نے نائلہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر گویا وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

شام کو اس کی اماں آئیں، کافی دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں، اسے تسلی کم اور اپنے گھر کا دکھرا زیادہ روتی رہیں۔

”نکما ہو کر گھر بیٹھ گیا ہے کسی کام جو گانہیں، اب میں نے کمال اور ناصر کو ایک ورکشاپ میں کھڑا کر دیا ہے خود سلائی کرتی ہوں تب کہیں جا کر گھر کی گاڑی چلتی ہے تیرے باپ کا بس چلے تو وہ ہم سے یہ چار پیسے بھی چھین لے۔“ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

”اب تم وہاں اپنے گھر آؤ گی یا.....؟“ وہ جانے سے پہلے پوچھنے لگیں۔

”اپنے گھر.....“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

”ہاں اب وہاں تمہارا کیا رہ گیا ہے جس کی وجہ سے وہاں تمہیں وہ تو رہا نہیں اور پتا نہیں اس

کے اماں اور اپا تمہیں رکھتے بھی ہیں کہ نہیں۔“ اسے اندیشوں میں دھکیل کر وہ چلی گئیں۔
 ”میرے خدا جب وہی گھر میرا مقدر تھا تو یہ درمیانی عرصہ میرے نصیب میں کیوں لکھا۔“
 شکوہ ہونٹوں پر چھلنے لگا۔ ”جب محبتوں سے آشنائی نہیں تھی۔ جب شہد آگہیں لہجے نہیں سنے تھے۔
 تب سب گوارا تھا، اور اب۔۔۔“ وہ تکیے میں منہ چھپا کر رو پڑی اور وہ مجھبتیں جنہیں اول روز اس
 نے دل کے نہال خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ انہیں بے آوازی صدا کیوں دینے لگی۔
 اگلے دن نائلہ کے ساتھ بابا اور احتشام بھائی کو دیکھ کر اس کے سارے حوصلے ٹوٹ گئے۔
 بابا کے سینے میں منہ چھپا کر اس نے سارے آنسو بہا ڈالے۔
 ”ہمارے ساتھ چل رہی ہوتاں۔۔۔؟“ بابا نے پوچھا۔ اور وہ خود بھی چاہتی تھی۔ اسی وقت
 جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

بے جی کا سامنا ہوا تو وہ ایک بار پھر بکھر گئی لیکن ان کا کمال تھا کہ وہ خود حوصلے سے کھڑی رہ
 کر اسے حوصلہ دیتی رہیں پھر اس کی گود سے بچنے لے کر بغور دیکھتی ہوئی کہنے لگیں۔
 ”دیکھو حسام نے دوسرا جنم لیا ہے۔“ اس تمام عرصے میں اس نے بے جی کے منہ سے یہ
 پہلی بات ایسی سنی جس نے اسے ان کی گزشتہ زندگی کا پتا دیا اور جس کے بارے میں حسام نے
 اپنے آخری وقت سے کچھ پہلے بہت کچھ بتایا تھا۔

○ ○ ○

وہی کمر تھا اور اس میں رہتی بسی اس کی مخصوص مہک بھی موجود تھی اور ہر چیز اسی جگہ جہاں
 وہ دونوں چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ ایک ایک قدم رکھتی رہی۔ کوئی نہ کوئی بات جواب یاد بن گئی تھی۔ اس
 کے سر پکڑ لیتی بچے کو مسہری پر لٹا کر وہ ہر ایک چیز کو چھو کر دیکھنے لگی۔ اس کی وہ ٹائی جو اس نے گلے
 میں سے کھینچ کر لاپرواہی سے ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر ڈال دی تھی اب بھی وہیں موجود تھی اور انہیں
 موجود تھا تو وہ جس نے اس کے مقدر سے بڑی بڑی خوشیاں چھین کر اس کی جھولی میں ڈالنے کا
 وعدہ کیا تھا اور وہ اپنے وعدے کا سچا تھا کہ اس مختصر عرصے میں اس نے اس کے دامن میں وہ
 انمول خوشیاں ڈالی تھیں کہ اس کی سنگت میں گزرا ایک ہل صدیوں پر بھاری تھا۔
 ”سنو میرے ہوا۔۔۔! میں اپنی باقی ماندہ حیات کا ہر پل تمہارے نام لکھتی ہوں۔“ اس
 نے عہد کیا۔

رات میں نائلہ اور صبیحہ کے ساتھ صائمہ بھابی بھی اس کے کمرے میں آ بیٹھیں اور ادھر ادھر
 کی باتوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔

”بھابی۔۔۔! اس کا نام کیا رکھیں گی۔۔۔؟“ صبیحہ بچے کو چھو کر پوچھنے لگی۔
 ”جو تم رکھ دو۔“

”نہیں بھابی۔۔۔! آپ نے کچھ سوچا تو ہوگا۔“

”میں نے۔۔۔“ وہ پرسوج انداز میں بولی۔ ”حسام کو“ علی“ نام پسند تھا۔“

”بس تو اس کا نام علی ہے۔“ دونوں بہنوں نے اسی وقت فیصلہ دے دیا۔
 ”چلو۔۔۔! اب تم لیٹ جاؤ۔ بہت دیر سے بیٹھی ہوئی ہو۔“

صائمہ بھابی اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”نائلہ صبیحہ۔۔۔! چلو۔۔۔ راج کو سونے دو۔“

”چلیں۔۔۔“ نائلہ کھڑی ہوئی پھر پہلے اسے لٹا کر اچھی طرح کبیل اوڑھایا۔ اس کے بعد

صائمہ بھابی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی، بڑے سکون سے رہتی اور پرسکون نیند سوتی تھی اور آج
 وقت کے ظالم بچے نے اس کی پرسکون نیند چھین کر اس کی آنکھوں کو رت جگا بخش دیا تھا۔ تمام
 رات وہ کروٹیں بدلتی اور چونک کر اٹھتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

زندگی بہت اداس اور بوجھل ہو گئی تھی۔ درود یوار سے ٹپکتی ویرانی دل دہلائے دیتی تھی۔ کچھ
 دن پہلے یہاں پر بے فکری تھی اور کھلکھلاتے چہرے تھے اور اب تو ہر چہرہ سہا ہوا دکھائی دیتا تھا اور
 سب کی آنکھوں میں ایک جیسے سوال چمکتے۔

یہ سب کیا ہو گیا۔۔۔؟

کیسے۔۔۔؟

ہمارے ہی ساتھ کیوں ہوا۔۔۔؟

بے جی اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ پہلے دن جب وہ گھر میں داخل ہوئی تھی تو ان سے
 سامنا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ ایک تو وہ خود بھی کسی ضرورت کے علاوہ
 کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ بے جی کے کمرے میں خود سے جانے کی ہمت جانے کیوں وہ اپنے
 آپ میں نہیں پاتی تھی۔ شاید یہ خیال کہ وہ ان کے بیٹے کی قاتل ہے۔ حقیقت میں وہ اپنے آپ کو
 مجرم تصور کرتی۔

کاش! وہ اس دن اس کے پیچھے نہ جاتی۔ وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی۔ تو وہ جس طرح
 گیا تھا اسی طرح واپس بھی آ جاتا۔ یا کاش وہ آنے میں دیر کرتا۔ یہاں تک کہ وقت کے ظالم بچے
 کی گرفت میں وہ خود آ جاتی۔

کاش۔۔۔!

اے کاش.....!!

وہ کتنی باتیں فرض کرتی اور اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ زندگی نے پہلے ہی بہت زخم لگائے تھے اور یہ آخری زخم تو بہت کاری تھا۔

جس دن حسام کا چالیسواں ہوا اسی دن اس کا چھلہ۔ اس دن عورت بہت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ یوں جیسے حقیقی معنوں میں نئی زندگی میں قدم رکھا ہو لیکن اس کا دل اور زیادہ بوجھل ہو گیا تھا۔ گھر میں قرآن خوانی تھی اور سب آنے والے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔

”اتنی سی عمر اور یہ روگ.....“ دلی دبی سرگوشیاں۔

”آگے پہاڑی زندگی کیسے کٹے گی.....؟“

وہ سر جھکائے خاموشی سے سب کی سرگوشیاں سنتی رہی اور جب ضبط کا بندھن ٹوٹنے لگا۔ آنکھوں کا پانی روکے نہ رکھتا تب وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی اماں بھی آئی ہوئی تھیں۔ قرآن خوانی کے بعد کافی دیر تک بے جی کے پاس بیٹھیں رہیں اور ان کے جانے سے پہلے بے جی اس کے کمرے میں آکر کہنے لگیں۔

”تمہاری اماں پوچھ رہی ہیں، تم ان کے ساتھ جاؤ گی یا.....؟“ وہ کتنی دیر تک ان کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ خود کہہ دیں تم مت جاؤ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یوں کھڑی رہیں جیسے اس کے جواب کی منتظر ہوں۔

”بے جی.....! مجھے اپنے سے جدا مت کریں۔“ اسے خود کہنا پڑا۔ بھیکے بھیکے لہجے میں التجا تھی۔ ”آپ اماں سے کہہ دیں کہ میں یہاں رہوں گی۔“

”تم یہاں نہیں رہ سکو گی۔“

”کیوں.....؟ کیوں نہیں رہ سکو گی.....؟“

”یہاں زندگی بہت دشوار ہوگی۔“

”مجھے ساری دشواریاں قبول ہیں لیکن خدا کے لیے مجھے یہاں سے جانے کے لیے مت کہیں۔“ وہ رونے لگی۔ بے جی کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

”بہر حال میں تمہیں کچھ وقت دیتی ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ لو پھر فیصلہ کرنا۔“

اس نے انہیں کمرے سے نکلنے ہوئے دیکھا پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

رات اس کے مقدمہ کی طرح سیاہ تھی۔ ہر طرف خاموشی اور گہرا سناٹا تھا۔ تاریکی میں اس نے وال ٹاک پر نظر پڑا۔ دو بج رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس

نے سونے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ بے جی نے سوچنے کے لیے کہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ کیا سوچے۔ جانے بے جی نے کن دشواریوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کا ذہن اُن اُن دیکھی دشواریوں تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ جبکہ گزشتہ زندگی کی دشواریاں اسے اب بھی ازبر تھیں۔ وہ بھولی نہیں تھی۔ جب ابا نشے میں اپنے حواس کھو کر امی پر چڑھ دوڑتے تھے۔ وہ اور فرار..... سہم کر کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ ابا پہلے چیخنے چلاتے، گالیاں دیتے۔ وہ شاید امی سے پیسوں کا مطالبہ کرتے تھے اور امی کے مسلسل انکار پر وہ اس قدر مشتعل ہوتے کہ مارنے پر اتر آتے جو چیز ہاتھ لگتی وہی کھینچ مارتے اور آخر کو فرار کو مار دینے کی دھمکی۔ امی ہاتھ جوڑ کر فریاد کرتیں اور پھر جو کچھ ان کے پاس ہوتا ابا کے حوالے کر دیتی تھیں۔ ابا ہی کی وجہ سے فرار جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اور فرار کے غم نے امی کی جان لے لی۔ پھر ایک دوسری عورت جو ابا کی زندگی میں تو بہت پہلے داخل ہو چکی تھی۔ امی کے بعد اس گھر میں بھی داخل ہو گئی۔ جس کے بارے میں ابا نے کہا تھا یہ تمہاری ماں ہے اور وہ ایک عمر اس میں اپنی امی کا عکس تلاش کرتی رہی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں صرف سوتیلی ماں تھی۔ اس نے جو سلوک چاہا اس کے ساتھ روا رکھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ بائبل کے آئین میں وہ اس عذاب زندگی سے کبھی نہیں نکل سکی تھی۔ لیکن اوپر والے نے شاید اسے مایوسیوں سے نکالنے کی خاطر کچھ اچھے دنوں کی جھلک دکھا دی تھی اور اچھے دن تھوڑے سبھی پھر بھی اس کی گزشتہ زندگی پر بھاری تھے۔

”یہاں زندگی بہت دشوار ہوگی۔“ بے جی کہہ کر گئی تھیں۔

”شاید بے جی نے وہ دشواریاں نہیں دیکھیں جن سے گزر کر میں یہاں تک آئی ہوں۔“ وہ سوچنے لگی۔ ”اگر بے جی اگر ان کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتیں تو ایسی بات نہ کہتیں اور پھر میں اکیلی نہیں ہوں جو واپسی کے لیے سوچوں۔ میرے ساتھ علی ہے جو حسام اپنی امانت کے طور پر میری جھولی میں ڈال گئے ہیں۔ اور اس امانت کی..... حفاظت اور پرورش میں یہاں بہتر طور پر کر سکتی ہوں۔ جب کہ اس ماحول میں یہ قطعی ناممکن ہے۔“

آخر میں اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ وہ واپس نہیں جائے گی۔

اگلے دن وہ بے جی کے سامنے سر جھکائے کھڑی کہہ رہی تھی۔

”بے جی.....! میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں رہوں گی۔ آپ کے پاس۔ مجھے اور

علی کو آپ کی ضرورت ہے۔“

”تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے.....؟“

”جی.....!“

”ٹھیک ہے اپنے کمرے میں جاؤ۔“

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ شاید قدرے مطمئن بھی تھی کہ وہ یہ محبتوں بھرا سا بنان اس سے چھٹے گا نہیں۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ بے جی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک چوٹی سے گھڑی تھی جو آتے ہی انہوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”تم دھوا ہو۔“ تین لفظوں میں انہوں نے اس پر اس کی حقیقت آشکار کرادی۔

”بے جی.....!“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش۔

”تم نے اپنے لیے یہ راستہ خود منتخب کیا ہے۔“

بے جی کا ٹھہرا ہوا اور سفاک لہجہ۔ وہ سبھی کبھی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب یہ پرچار راستہ ہی تمہارا مقدر ہے۔“ انہوں نے کہا پھر بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی جس میں فقط دو جوڑیاں ہی رہ گئی تھیں اور انہیں بے جی نے اپنی مٹھی میں لے کر اس طرح دبایا کہ وہ چور چور ہو گئیں۔ کچھ کالج اس کی کلائی میں بیوست ہوئے کچھ بے جی کی ہتھیلی میں چبے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی۔ گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”اس میں تمہارے کپڑے ہیں، ابھی پہن لو۔“ وہ یونہی کھڑی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ کمرے سے نکل گئیں۔ تب اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا جس پر جا بجا خون کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اسے جھپکنا احساس ہونے لگا تو اس نے بڑی احتیاط سے کالج کے ریزے صاف کیے اور کلائی کو دوسری ہتھیلی سے تھام لیا پھر فوراً ہی اسے گھڑی کا خیال آیا تو وہ اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ سفید مٹل کی ساڑھی اور اسٹینچ کی دوپٹی والی چپل۔

”ہتا ہے رابی.....! بے جی نے اپنا مذہب تو چھوڑ دیا۔ لیکن بعض روایات نہیں چھوڑ سکیں۔“ حسام نے بے جی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔

”اگر بے جی کے گزشتہ مذہب میں بھی ”ستی“ (زندہ جلا دینا) ہونے کی روایت ہوتی تو شاید وہ مجھے حسام کے ساتھ ہی دفن بھی کر دیتیں۔“ اس نے سوچا اور گھڑی لے کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بالوں کو کس کے ایک چوٹی میں گوندھ رہی تھی۔

”اے وقت میں کبھی تجھے مات نہیں دے سکوں گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میرے دل میں ایک ذرا سا طمینان ہی تو تھا۔ تو نے وہ بھی۔“

”بھابی.....!“ نائلہ نے اندر آ کر اس کی سوچوں کو منتشر کر دیا۔ وہ ساڑھی کا پلو سر پر بٹائی

ہوئی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ.....!“ نائلہ سر تا پا اسے دیکھتے ہوئی بولی۔ پھر بڑھ کر اس کا پلو کھینچ لیا۔

”آپ ہر دم ہمیں یہ احساس دلانا چاہتی ہیں کہ ہمارا بھائی نہیں رہا۔ خدا کے لیے اتار دیجیے بارود۔“ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ نائلہ جانے کیا سمجھی۔ چیخ کر بے جی کو آواز دینے لگی۔ بے جی کے ساتھ صبیحہ اور صائدہ بھابی بھی بھاگی چلی آئیں۔

”دیکھتے تو بے جی.....! بھابی نے یہ کیسا روپ دھار لیا ہے ان سے کہیں ہمیں تلخ حقیقت سمجھانے کی کوشش نہ کریں ہمیں۔ اس فریب میں مبتلا رہنے دیں کہ ہمارا بھائی کہیں آس پاس موجود ہے۔“

”نائلہ.....!“ بے جی نے اسے خاموش کرادیا۔

”اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”نہیں..... پہلے بھابی سے کہیں۔“

”راہجہ نے ہمارے کہنے پر یہ روپ دھارا ہے۔“ بے جی نے کہا تو نائلہ ایک دم خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ یوں جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔

”میں کسی کو فریب میں نہیں دیکھنا چاہتی۔“ بے جی کہنے لگیں۔

”حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو بہر حال حقیقت ہوتی ہے اور اس سے نظریں چرانا بزدلی ہے۔“

”بے جی.....!“ نائلہ ہاتھوں میں چہرہ اچھپا کر رو پڑی۔

”بھابی کو سفید کفن پہناتے ہوئے آپ کو خیال نہیں آیا کہ حسام انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا۔ ذرا سوچیے تو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اسے۔“ پھر صبیحہ نے بھی نائلہ کا ساتھ دیا لیکن بے جی پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دونوں بہنوں کو روتا چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔

گھر میں دبا دبا سا احتجاج جاگ اٹھا تھا۔ بے جی اکیلی تھیں اور بقیہ سارے گھر والے ایک طرف۔ پھر بھی بے جی کو ان کے متوقف سے نہ ہٹا سکے۔ گھر کا ماحول خاصا کشیدہ ہو گیا تھا۔ اور وہ اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھنے لگی۔ تاہم صبیحہ اور انعام اسے بھی احتجاج پر اکساتے، لیکن وہ بزدل تھی، ان کے حوصلہ دلانے پر بھی اپنے اندر رمت پیدا نہ کر سکی۔ کیونکہ بے جی کی جھپکتی ہوئی نظریں وہ ہر وقت اپنے وجود پر محسوس کرتی تھیں اور اسے ڈر تھا کہ کہیں بے جی اس سے یہ سائبان چھین نہ لیں۔ مگر کے باقی لوگ اب بھی جب موقع دیکھتے بے جی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے اور جب انکی بات ہوتی تو گھر کی فضا نئے سرے سے مکر رہوٹے لگتی تھی اور وہ ایسی ہی فضا سے نکلنے کی خاطر

اس روزان تینوں بہن بھائی سے الجھ پڑی۔

”تم لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ جب میرے اندر کوئی خواہش ہی نہیں ابھرتی تو تم لوگ کیوں الجھتے ہو۔ ساری خواہشیں اور زندگی کا مزہ تو اس کے ساتھ تھا، وہ نہیں رہا تو اب کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے۔“

”بات چاہنے نہ چاہنے کی نہیں ہے بھائی۔ آپ یہ دیکھیں کہ بے جی ایک ہندو اندر رسم کو اس گھر پر مسلط کر رہی ہیں۔“

”کیا کیا ہے انہوں نے۔ ایک سفید لبادہ ہی تو اڑھایا ہے مجھے۔“

”بات اگر اس سفید لبادے تک رہے تو ہم خاموش ہو جائیں گے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ بے جی یہیں تک بس نہیں کریں گی۔“

”پھر.....؟“

”مزید کچھ کہنا قتل از وقت ہے بلکہ کہنے پر دل آمادہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بات کو بعد کے لیے اٹھا رکھیے۔“

نانکھ نے کہا تو وہ فوراً کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے لیکن تم لوگ اب بے جی سے نہیں الجھو گے۔“

”اے کہتے ہیں مدعی ست گواہ چست۔“ انعام کہنے لگا۔

”یعنی ہم آپ کی خاطر لڑ رہے ہیں اور آپ ہی میدان چھوڑ رہی ہیں۔“

”نہ صرف خود چھوڑ رہی ہیں بلکہ ہمیں بھی چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہیں۔“ صبیحہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں چلیں.....؟“

”نیند آ رہی ہے، اب سوؤں گی۔“

”چلو ہم بھی چلتے ہیں۔“ وہ تینوں جانے لگے تو اس نے نانکھ کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں سے رکنے کا اشارہ کیا۔

”تم دونوں جاؤ۔ میں کچھ دیر بھائی کے پاس بیٹھوں گی۔“ نانکھ دوبارہ بیٹھ گئی۔ پھر جیسے ہی صبیحہ اور انعام کمرے سے نکلے، وہ پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے.....؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ بس یوں ہی میرا دل تم سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔“ علی کو چادر اوڑھانے کی غرض سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

”بھابی.....! بلا تمہید وہ بات کہہ دیں جس کے لیے آپ نے مجھے روکا ہے۔“ وہ حیران ہوئی اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قائل بھی۔ پھر بھی کہنے لگی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے تمہیں خاص بات کے لیے روکا ہے۔“

”ہاں.....!“ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کے کہنے کے مطابق بغیر تمہید باوجود کہنے لگی۔

”حسام نے مجھے ابرار کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی کہ بے جی.....“ اس کی باقی بات نانکھ کی طویل سانس میں دب گئی۔

”کیا بے جی کے رویے میں کچھ ٹپک پیدا ہوئی.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”نہیں.....“ نانکھ کے ہونٹوں نے ایک ذرا سے نہیں کو کیا چھوا کہ دل کا تمام احوال اس کے چہرے پر دم ہو گیا۔ وہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ڈکھ بھی ہوا۔ خود کمزور تھی اس کے باوجود اسے حوصلہ دینے لگی۔

”تم بے جی سے بات کرو۔“

”صرف بات..... ہم تو ان سے لڑ لڑ رہے۔“ افسوس اور تلخی نے اس کی آنکھوں میں نمی اتار دی۔

”کتنی عزیز ہیں..... اور جب تک میں آپ کو آپ کا کھویا ہوا مقام نہیں دلا دوں گی چین سے نہیں رہوں گی۔“

”کیا ہوا ہے مجھے، ٹھیک تو ہوں۔“

”آپ کیونکہ ہر بات کو مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں اس لیے ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ تو آپ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں۔“

”میری بات چھوڑا..... تم اپنی بات کرو۔“

”اپنی بات تو اب اتنی سی ہے کہ امتحان سر پر ہیں اور میجر عاطف کے گھر والوں کا آنا جانا کچھ زیادہ ہے۔ مجھے لگتا ہے، بے جی میرے امتحانوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس کے بعد.....“

”اور وہ ابرار.....“ وہ فوراً بول پڑی۔

”ابرار خواب ہو گیا ہے۔“

”جب تم احتجاج کا حوصلہ رکھتی ہو تو پھر کیوں ہتھیار ڈال رہی ہو.....؟“

”میرے احتجاج کی فوری شنوائی ممکن نہیں ہے اور میں ابرار کو ایک طویل عرصہ انتظار کی بیڑیوں پر کھڑا رہنے کو نہیں کہہ سکتی۔“

”کیا تمہیں اس پر بھروسہ نہیں ہے.....؟“

”بھروسے کی بات نہیں ہے بھابی.....! اصل میں حسام کے بعد اب بے گئی سے لڑنا دل نہیں چاہتا۔“ وہ طویل سانس لے کر ریک کی طرف دیکھنے لگی۔ جس پر حسام کی تصویر کی گئی۔

○○○

وقت کا پہلا اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا ان دنوں وہ تینوں بہن بھائی اپنے امتحانوں میں مصروف تھے اس لیے کوئی بھی اسے وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں بند علی کے ساتھ مصروف رہتی۔ صائمہ بھابی بھی فارغ نہیں تھیں۔ کیونکہ امتحانوں کے بعد شادی طے پائی تھی بے جی کے ساتھ تیار یوں میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا بھی دل چاہتا وہ بے جی کا ہاتھ بٹائے اور وہ ایک بار ان کے پاس گئی بھی تھی لیکن انہوں نے صاف منع کر دیا۔ ”تم کسی چیز کا ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔“ انہوں نے اتنی سختی سے کہا تھا کہ وہ پھر ان کے سامنے تک جانے کی جرات نہ کر سکی۔

پھر جیسے ہی امتحان ختم ہوئے گھر میں شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی ہو گئی۔ وقت بے وقت مہمانوں کی آمد، وہ شاید ان کی تواضع پر مقرر ہو گئی تھی۔ کمرے سے کچن اور کچن سے کمرہ بس یہی ایک اس کا راستہ تھا۔ اس راستے سے ہٹ کر اول تو وہ چلتی نہیں تھی اور جو کسی بہت اہم ضرورت کے تحت کسی اور طرف نکلتی تو بے جی ایسی نظروں سے دیکھتیں کہ وہ فوراً اپنے کمرے میں پناہ لیتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ بے جی اسے منحوس تصور کرتی ہیں۔ اسی لیے ان کی کوشش ہے کہ اس گھر کی خوشیوں پر اس کا سایہ تک نہ پڑنے پائے۔ مایوں اور مہندی کی رسم میں انہوں نے اسے خاص ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کمرے سے نہ نکلے۔ اسے خود بھی احساس تھا اور وہ وقت کے ظالم پنجے سے بھی خوفزدہ تھی۔ اس لیے اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ ایک دو بار صمیمات بلانے بھی آئی لیکن اس نے پہلے ہی سے سر میں دوپٹہ باندھ لیا تھا۔ اور شدید سر درد کا بہانا کر کے اسے ٹال دیا۔

بارات کا انتظام گھر پر تھا۔ کوشی کے سامنے والے لان میں کرسیاں بچھا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا جبکہ پچھلے لان میں خواتین کا۔ کھانے کا انتظام بڑے ہال کمرے اور چھت پر کیا گیا تھا۔ وہ شاید آج بھی کمرے سے نہ نکلتی لیکن شاید کچھ خواتین نے بے جی سے اس کی بابت پوچھا اس لیے بے جی نے خود کر خواتین کے حصے تک جانے کی اجازت دی۔ جس وقت وہ پچھلی طرف لان میں آئی بہت سی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ جوں کی

طرف متوجہ نہیں تھا وہ بھی متوجہ ہوا۔ سفید ساڑھی میں لپٹا اس کا نازک سراپا جگمگاتی برسات میں نمایاں ہو گیا تھا۔ ہر قسم کے میک اپ سے پاک اس کا اجلا اجلا چہرہ جس پر معصومیت کے ساتھ ایک سوز تھا جو ہر نظر کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا اس میں اس کی ارادی کوشش کو قطعی دخل نہیں تھا بلکہ وہ اتنی بہت ساری نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے نروس ہو رہی تھی۔

”ارے صبیحہ.....! یہ کون ہے.....؟“ اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔

”مجھے تو کوئی روح لگ رہی ہے۔ جو بھٹک کر یہاں آ گئی ہو۔“ صبیحہ کے جواب دینے سے پہلے ہی دوسری آواز آئی۔

”بے گئی کو مل سی..... اس عام سی ساڑھی میں غضب ڈھا رہی ہے۔“

”کون ہے.....؟“

”میری بھابی.....!“

”ارے.....!“ حیرت اور اشتیاق کی ملی جلی آوازیں۔ اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ لیکن ایک جگہ پھر اس کے قدم رک گئے۔ کچھ خواتین بے جی سے اس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

”بیگم حیات.....! آپ کی بہو کو بہت کم عمری میں دھکا لگا۔“

”ہاں ابھی تو بے چاری کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔“

ایک اور آواز.....

”ایک بیٹا بھی ہے ناں.....؟“

”ایک بات کہوں بیگم حیات.....!“ کسی نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

”آپ کا ماشاء اللہ ایک اور بیٹا بھی تو ہے، اس سے نکاح کر دیں۔“

”کیا.....؟“ بے جی کی آواز میں ناگواری تھی۔

”ہاں.....! گھر کی عزت گھر ہی میں رہے گی..... اور پھر ماشاء اللہ لڑکی بہت پیاری ہے۔ صورت کی بھی سیرت کی بھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو بیٹے کو لے کر چلتی بنتی۔“

”بیگم خان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ فرصت میں سنجیدگی سے سوچے گا۔ اس طرح آپ کا پوتا بیٹی سے بچ جائے گا۔“

وہ بے جی کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ ہر طرف وہی موضوع تھا۔ اس نے گھبرا کر اندر کی راہ لی۔ برآمدے سے گزر کر گیلری میں قدم رکھا تو بری طرح کسی سے ٹکرا گئی۔ فوراً پیچھے ہٹنے کے تیجے میں پھر مڑ گیا جس سے توازن قائم نہ رکھ سکی۔ گرنے کو تھی کہ سامنے والے نے بڑھ کر

تھام لیا۔
”میرے خدا!...“ دھڑکنیں ساتھ چھوڑنے لگیں۔ مارے خوف کے اس کے ہاتھ جھلک کر فوراً دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ!...“ وہ شاید تعارف چاہتا تھا اور وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگی۔

”میں آصف ہوں۔ آصف جہانگیر۔“ اس کے خاموش رہنے پر اپنا تعارف کرا ڈالا۔

انداز بتا رہا تھا ایک عمر کی تلاش ختم ہوئی اور اس کے لیے تو یہ ساری باتیں بے معنی تھیں۔ کچھ دروازے اس نے خود بند کیے تھے اور کچھ پر بے جی نے پہرے بٹھادیے تھے۔ اس کی نظروں کی وارنگلیوں کو نظر انداز کرتی اسی خاموشی سے اس کے قریب سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے خیال نہیں آیا کہ باہر کھڑا آصف جہانگیر کتنی دیر تک اس کے بند دروازے کو دیکھتا رہا تھا اور قدم بڑھانے سے پہلے اس بند دروازے پر دستک دینے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

پھر رخصتی سے کچھ پہلے نالہ خود اس کے کمرے میں آ گئی۔ اس کے حیرت سے دیکھنے پر کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں، بے جی نے آپ کو میرے پاس آنے سے منع کیا ہو گا اس لیے میں خود آپ سے ملنے آ گئی ہوں۔“ وہ ڈر گئی۔ خوفزدہ ہوئی کہیں اس کا منحوس سایہ نالہ کی خوشیوں کی راہ میں حائل نہ ہو۔

”تم یہاں کیوں آ گئیں؟“

”آپ جو نہیں آئیں۔“

”کوئی مصلحت تھی جیسی تو نہیں آئی۔ اب پلیز تم جاؤ۔“

”آپ سے ملے بغیر اور آپ کی دعائیں لیے بغیر تو نہیں جاؤں گی۔“

”کیا؟“ وہ پیچھے ہٹنے لگی۔

”جتنا مرضی بھاگ لیں۔ یہ ملے ہے کہ میں آپ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی چاہے بار بار تھک کر واپس ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

”ایسی باتیں منہ سے مت نکالو۔“ وہ چیخ پڑی

”تو پھر آئیے۔“ نالہ نے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ اس کی ضد جانتی تھی اس لیے بڑھ کر اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

”سدا سہاگن رہو۔“ وہ یہی دعا دے سکتی تھی۔

”کاش! میں بھی پلٹ کر یہی دعا آپ کو دے سکتی۔“ دونوں کی پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔ وہ فوراً اس سے الگ ہو گئی۔

”اب تم جاؤ ورنہ بے جی خفا ہوں گی۔“ نالہ نے بڑھ کر کار میں بیٹھے علی کو پیار کیا، پھر جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔

○ ○ ○

بے جی کو جہاں نالہ کی شادی بخیر و خوبی ہو جانے پر اطمینان تھا وہاں لوگوں کی باتوں نے انہیں سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگیں، ایسا نہ ہو کسی دن خضر حیات کے دل میں بھی یہ بات سما جائے کہ وہ رابعہ کا نکاح انعام سے کرنے کی بات کرنے لگیں۔ گو کہ وہ ان کے سامنے بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔ پھر بھی شاید اندر کہیں کسی خدشے نے اجڑائیاں لپٹی شروع کر دی تھیں کہ وہ کسی مقام پر بالکل تنہا ہو کر کمزور نہ پڑ جائیں ابھی تو خیر خضر حیات اگر ان کی حمایت نہیں کرتے تھے تو مخالفت بھی نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ اطمینان سے خیر اور اب لوگوں کی باتوں نے ان کا اطمینان تقریباً چھین لیا تھا۔

”ایک بیوہ عورت کی دوبارہ شادی قطعی ناممکن ہے۔“ وہ جو کئی روز سے یہ بات سوچ رہی تھیں اس وقت بلا ارادہ ان کے منہ سے نکل بھی گئی اور خضر حیات جو اس وقت اخبار دیکھنے میں مصروف تھے ان کی بات پر چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے۔

”کس نے کہا؟“

”میں کہہ رہی ہوں۔“

”بالکل غلط کہہ رہی ہیں آپ ہمارے مذہب میں ایسی کوئی بندش نہیں ہے۔“

بے جی کو افسوس ہوا کہ انہوں نے یہ موضوع کیوں چھیڑ دیا۔ اب ایسا نہ ہو خضر حیات انہیں دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کریں۔

”بہر حال... میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔“ وہ سرسری انداز میں اپنا خیال ظاہر کرتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئیں۔

ذاتی طور پر بات ٹل گئی لیکن وہ جانتی تھیں کہ کسی نہ کسی وقت یہ موضوع تفصیل سے زیر بحث آئے گا اور وہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اس کا سد باب کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے بہت زور و شور سے انعام کے لیے لڑکی کی تلاش کرنی شروع کر دی۔ وہ جو گھر سے زیادہ نکلتی نہیں تھیں اب ہر تہہ سے چوتھے دن کہیں نہ کہیں جا رہی ہوئیں۔ اس روز بھی ناشتے کی ٹیبل پر وہ کہیں

جانے کی بات کر رہی تھیں جب احتشام کہنے لگے۔
 ”بے جی.....! آپ کو ادھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی تو گھر ہی میں موجود ہے۔“

”کون.....؟“ وہ یونہی بے دھیانی میں احتشام کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”میں رابعہ کی بات کر رہا ہوں۔“

”یہاں رابعہ کا کیا ذکر..... میں انعام کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔“

”میں بھی انعام اور رابعہ کی شادی.....“

”احتشام.....!“ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بے جی زور سے چلائیں اور جرحہ چائے کی ٹرے لے کر اندر آ رہی تھی ڈر کر وہیں رک گئی۔

”میں نے ایسی کوئی نامناسب بات تو نہیں کہی بے جی.....!“

”میرے نزدیک سب سے نامناسب بات یہی ہے سمجھتے تم.....!“

”آخر آپ کو رابعہ کے بارے میں سوچنا ہے کہ نہیں۔“

”نہیں.....“ صاف انکار۔

”کیوں.....؟ آخر وہ کب تک اس طرح زندگی گزارے گی.....؟“

”یہی زندگی اس کا مقدر ہے۔“ انتہائی غصے کے عالم میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئیں اور وہ جو دروازے کے اس طرف کھڑی سوچ رہی تھی کہ اندر جائے یا بیہیں سے واپس پلٹ جائے کہ تیزی سے نکلتی ہوئی بے جی اسی سے جا ٹکرائیں، اس کے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے چھوٹ گئی اور ایک شور اس خاموش فضا میں گونجتا چلا گیا۔

”کیا ہوا.....؟“ ڈائننگ روم سے ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں اور اس سے پہلے کہ کوئی یہاں تک آتا، بے جی اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اس کے کمرے میں لے گئیں۔

”تم نے اسی لیے اس گھر میں رہنا منظور کیا تھا۔“ بے جی کا سفاک لہجہ۔ وہ رونے لگی۔

”میرا یقین کریں بے جی میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔“

”سوچنا بھی مت۔“ ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔ اور

ابھی اس نئی صورت حال اور افتاد کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ایک کے بعد ایک سب اس کے کمرے میں چلے آئے۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا بیٹا.....! ٹرے تمہارے ہاتھوں میں سے گری تھی۔“

بابا کا لہجہ بے جی سے یکسر مختلف تھا۔

”جی.....!“

”پھر تم یہاں کیوں چلی آئیں.....؟“

”مجھے ڈر تھا کہ میں آپ خفا نہ ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”ارے.....! اس میں خفگی کی کیا بات ہے۔ ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔“ اس نے سر جھکا

لیا۔ ”اور یہ بے جی کہاں گئیں.....؟“ احتشام بھائی نے یوں پوچھا جیسے انہیں یقین ہو کہ بے

جی یہاں ضرور آئی ہوں گی۔

”پتا نہیں.....“ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

”کیا وہ ابھی یہاں نہیں آئی تھیں.....؟“ احتشام بھائی کا انداز مشکوک تھا۔ اس کے باوجود

وہ پھر جھوٹ بول گئی۔

”نہیں تو.....“

”اچھا چلو ناشا کرو۔“ بابا بات ختم کرنے کی غرض سے بولے پھر جاتے جاتے علی کی طرف

متوجہ ہوئے جو بیڈ کے سہارے کھڑا معصوم سا چہرہ اونچا کیے انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بچوں کی

خاص طور سے شیر خوار بچوں کی ایک دل موہ لینے والی ایک خاص ادا ہوتی ہے کہ جب کوئی ان کی

طرف متوجہ نہیں ہوتا تو وہ بہت معصومیت اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں اور جیسے

ہی ان کی طرف دیکھو تو وہ شرمناک مسکراتے ہوئے سر جھکا لیتے ہیں اسی طرح پتھر سے پتھر دل انسان

بھی بے اختیار ان کی طرف لپکتا ہے۔ اس وقت علی نے بھی ایسا ہی کیا اور مقابل تو خضر حیات

تھے۔ اس کے قریب ہی گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے۔

”میری جان.....!“ فرط محبت سے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”بابا یہ گندا ہو رہا ہے۔“ اس نے بڑھ کر علی کو لینا چاہا۔

”ارے.....! تو ہم کون سا اچھے ہیں۔“ وہ اسے گود میں لیے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ پھر

تنہی انداز میں کہنے لگے۔

”بچے گندے نہیں ہوتے۔“

”دیکھئے تو بابا یہ حسام سے کتنا ملتا ہے۔“ احتشام بھائی بغور علی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہاں.....! اس عمر میں وہ بالکل ایسا ہی تھا۔“ گزرا وقت ایک دم بابا کی آنکھوں میں آ

نایا۔

”ابھی مجھے لگا جیسے وہی میرے سینے میں آچھا ہو کل ہی کی تو بات ہے، اسی طرح میں نے

اسے اٹھایا تھا اور تمہاری بے جی نے کہا، یہ گندا ہو رہا ہے۔“ ان کی آواز کا بوجھل پن ماحول میں رز آتا تھا۔

○ ○ ○

اوائل سردیوں کی مگلابی شام تھی۔ وہ علی کو گود میں لے کر پچھلی طرف کے برآمدے میں اگل گئی۔ فضا میں اتری ہلکی ہلکی سے خنکی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ یونہی شہلتی ہوئی برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی اور جب واپس چلی تو نائلہ اسے پکارتی ہوئی آ رہی تھی۔
”تم کب آئیں.....؟“ اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ایک بازو نائلہ کی گردن میں ڈال دیا۔

”ابھی بس کچھ ہی دیر پہلے اور یہ آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں.....؟“
”کچھ نہیں..... آؤ اندر چلو۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو نائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ادھر نہیں ادھر..... کیا عاطف سے نہیں ملیں گی.....؟“

”ہاں.....! کیوں نہیں..... تم چلو میں آتی ہوں۔“ اسے بے جی کا خیال آیا تو پس و پیش کرنے لگی۔

”میں جانتی ہوں پھر آپ نہیں آئیں گی، اس لیے میرے ساتھ چلیں۔“ وہ واقعی نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن نائلہ زبردستی اسے لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ بے جی کے لیے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ انہوں نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ دروازے کے قریب ہی رک گئی اور عاطف کے ساتھ بیٹھے آصف جہا نگیر نے بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر انجانے میں اس کی پوزیشن مزید خراب کر دی۔

”مجھے جانے دو۔“ اس نے سرگوشی میں نائلہ سے کہا لیکن وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی اسے کھینچ کر آگے لے آئی۔

”یہ رابعد ہے.....“ نائلہ نے کہا پھر اسے بٹھانے کے بعد اس کا تفصیلی تعارف کروانے لگی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن اس کا سارا دھیان بے جی کی طرف تھا جن کے ہونٹ بھی شور مچاتے لگ رہے تھے۔

”تم کیوں آئیں.....؟ جاؤ یہاں سے.....“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
”اے.....! آپ کھڑی کیوں ہو گئیں.....؟ بیٹھیں نا.....“ عاطف کے کہنے پر اس نے

عذر تراشا۔

”میں چائے لے آؤں۔“

”نہیں بھابی.....! ہم چائے نہیں پیئیں گے۔“ عاطف درمیان میں بول پڑا۔ نائلہ نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ پھر کہنے لگی۔

”اصل میں اس وقت ہم آصف بھائی کے مہمان ہیں ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ یہاں سے گزر رہا تو سوچا آپ سب سے ملتے چلیں۔“ اس نے یونہی بلا ارادہ آصف کی طرف دیکھا تو نائلہ ان کا تعارف کروانے لگی۔

”یہ عاطف کے بڑے بھائی ہیں۔“

”صرف بھائی نہیں.....“ عاطف درمیان میں بول پڑا۔

”میرے ماں باپ بھائی دوست سبھی کچھ ہیں اور آج میں جو کچھ ہوں انہی کی بدولت۔“ وہ کیا کہتی خاموش ہی رہی۔

”رابعہ.....! علی کو لے جاؤ۔“ بے جی نے کہا تو نائلہ فوراً بول پڑی۔

”کیوں بے جی.....! بیٹھنے دیں ناں بھابی کو۔“

”سردی بڑھ رہی ہے اور علی نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور وہ تو خود بھی جانا چاہ رہی تھی فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ تو چلی گئی لیکن اس کا ذکر وہیں رہ گیا۔ جتنی دیر تک نائلہ، عاطف اور آصف جہا نگیر بیٹھے، اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے جو بے جی کو پہلے ناگوار گزریں پھر تشویش کا باعث بنیں، کیونکہ وہ سب اسے دوبارہ زندگی کی رنگینیوں کی طرف لانے کی باتیں کرنے لگے تھے۔

بے جی اگر چاہتیں تو اسے گھر سے نکال کر سارا قصہ ہی ختم کر دیتیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک تو وہ اکیلی نہیں تھیں۔ اس کی گود میں جسام کا بیٹا بھی تھا جس سے دستبردار ہونے کو بے جی تیار نہیں تھیں۔ دوسرے وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھیں کیونکہ اپنی روایت پراڑے رہنا اپنی جگہ، وہ ماں بھی تھیں کہ اس گھر سے نکل کر اسے کہیں امان نہیں ملے گی۔

آخر اس نے یونہی تو نہیں اپنے باپ کی نسبت ان کے پاس رہنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ یہاں اپنی مرضی سے رکے اور اب بقیہ زندگی ان کی مرضی سے گزارے۔

اور.....

خضر حیات تو برسوں پہلے ہی انخسر کا نظام بے جی کے ہاتھوں میں دے کر خود بری الذمہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے کبھی گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ بے جی ہی سیاہ و سفید کی مالک تھیں

اور اب تک وہ ہر معاملے کو بخوبی نپٹاتی آئی تھیں۔ رابعہ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ بے باقی اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی سوچیں گی اور پھر اتنا زیادہ وقت تو نہیں گزر رہا تھا ان کے خیال میں۔ وہ کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ یعنی وہ نہ تو خود اس کے لیے سوچنے کو تیار تھیں اور نہ ہی کسی اور کو ایسا کرنے دے رہی تھیں۔

”حسام اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔“ وہ غیر جانب داری سے سوچنے لگے۔

”اور اب اس کے لیے اس لڑکی رابعہ کو تمام عمر یونہی بٹھائے رکھنا زیادتی ہے اور ہم یقیناً اس کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔“

پھر انہیں احتشام کی بات یاد آئی۔ وہ رابعہ اور انعام کے نکاح کی بات کر رہے تھے۔ خیر حیات نے اس منہ پر سوچا تو انہیں بھی یہی بات مناسب لگی لیکن اب سارا مسئلہ بے جی کو اس بات پر راضی کرنا تھا۔ خیر حیات نے کبھی بے جی کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اختلاف کا موقع نہیں دیا تھا اور اب جب زندگی میں پہلی بار یہ موقع آیا تو وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی تلخی پیدا ہو۔ وہ سوچنے لگے کوئی ایسا طریقہ جو بے جی سے اچھے بغیر بات بن جائے۔ اگلے کئی دن انہوں نے بڑی سنجیدگی سے سوچنے میں گزارے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ گھر کا جائزہ بھی لیتے رہے۔ خاص طور سے وہ بے جی کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے کہ وہ رابعہ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ پورے ایک ہفتے میں انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ کچھ یوں تھا۔

رابعہ زیادہ اپنے کمرے ہی میں رہتی ہے۔ کھانے کے وقت موجود تو ہوتی ہے لیکن سب کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتی۔ گھر میں آئے کسی مہمان کے سامنے جانے کی اسے اجازت نہیں۔

بننے پر بھی شاید پابندی ہے جیسی تو ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر جدا ہونا بھول گئے ہیں۔ غرض زندگی اس کے نزدیک صرف آتی جاتی سانسوں کا نام ہے سانس جاری ہے اور وہ زندہ ہے۔ اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر اس کا کوئی حق نہیں رہا اور اس حق سے محروم اسے بے جی نے کیا ہے۔ اور بے جی کے مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ دو متضاد کیفیات میں گھری ہوئی ہیں۔ یعنی رابعہ پر زندگی کے راستے تنگ کر کے وہ مطمئن نہیں ہیں جہاں وہ اسے سب کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہونے دیتیں وہاں بعد میں ہدایت کرتی ہیں کہ آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔ اس طرح اور بہت سی باتیں کہ وہ اس سے غافل ہو کر بھی غافل نہیں رہتیں۔ یعنی اندر کہیں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور یہی بات خیر حیات کے لیے اطمینان بخش تھی۔ مزید اطمینان کے لیے انہوں نے بے جی کو آزمایا۔

اس رات رابعہ حسب معمول ان کے لیے دودھ سے بھرا گلاس لے کر آئی تو اسے دیکھتے ہی انہوں نے اپنی پیشانی پر ہل ڈال لیے اور ناگواری سے پوچھنے لگے۔

”کوئی اور نہیں ہوتا گھر میں؟“ لہجہ ایسا تھا کہ جہاں وہ اپنی جگہ رکھ رہی وہاں بے جی چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”صالحہ بیگم.....! یہ ذمہ داری کسی اور کو سونپ دیجیے۔“

”کیا مطلب.....؟“ بے جی بالکل نہیں سمجھیں۔

”رات آرام و سکون کے لیے ہوتی ہے اور یہ منحوس لڑکی روزانہ اس وقت آکر میرا سکون برباد کر دیتی ہے۔ میں ڈھنگ سے سو نہیں سکتا۔“

”کیا.....؟“ بے جی پورا منہ کھولے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ خود انہوں نے اگر رابعہ کے لیے سوچی بھی تو اس کے منہ پر کبھی نہیں کہی تھی۔

”اب خدا کے لیے اس سے کہیں جائے یہاں سے۔“ انہوں نے بیزارگی سے کہا تو بے جی اس کی طرف دیکھنے لگیں جو آنکھوں میں اترتے سیلاب کے آگے بند باندھنے میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔

”تم جاؤ رابعہ.....!“ وہ خود کب رکنا چاہتی تھی جیسے ہی بے جی نے کہا وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اور اس کے جاتے ہی بے جی کہنے لگیں۔

”آپ کو رابعہ کے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔“

”کیوں.....؟ کیا وہ منحوس نہیں ہے.....؟“

”اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس کے سامنے بھی کہا جائے۔“

”کیوں اس کے سامنے کہنے میں کیا ہے.....؟“

”نہیں خیر.....! اس کی دل آزاری ہوگی۔“

”دونوں باتیں ایک ساتھ.....“ وہ سوچنے لگے۔ ”منحوس بھی تصور کرتی ہیں اور دل آزاری کا بھی خیال ہے۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ وہ کہنے لگے۔ ”میں جیسا اس کے بارے میں سوچتا ہوں ویسی بات بھی کروں گا۔“

”کیا آپ نہیں جانتے کہ کسی کی دل آزاری کرنا کتابزدگانہ ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن میں دو غلاہن بھی اختیار نہیں کر سکتا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئے۔ یہ موضوع ختم کر دینے کا اشارہ تھا۔ بے

جی خاموش ہو رہی ہیں اور ان کے چہرے پر رابعہ کے لیے ہمدردی کے جذبات اور سوچ کی گہری لکیریں وہ آنکھوں کی جھریوں سے دیکھتے رہے تھے۔ خضر حیات کو عورت کی نفسیات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور نہ کبھی انہوں نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی زندگی میں صرف دو عورتوں کے قریب رہے تھے، ایک اپنی والدہ اور دوسری بے جی..... بہن کوئی تھی نہیں اور اولاد کو وہ زیادہ وقت نہیں دے سکے تھے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ پہلی بار انہوں نے گھر کے کسی معاملے کو سلجھانا چاہا تو وہ معاملہ صرف عورتوں ہی کا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ بات سامنے آئی کہ عورت بذات خود اپنی صنف پر خواہ کتنی ہی زیادتی کرے یا کتنے ہی ستم کیوں نہ توڑے لیکن جب یہی ستم زیادتی صنف مخالف کی طرف سے ہو تو وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ لہذا اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے رابعہ کے ساتھ اپنا رویہ بالکل ہی تبدیل کر دیا۔

اور رابعہ.....

خضر حیات کے کمرے سے آنے کے بعد وہ بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تو وہ خود اس کے کمرے میں آئے تھے اور نہ صرف بڑی شفقت سے بات کی بلکہ علی کو بھی گود میں اٹھایا تھا۔ پھر اچانک۔ وہ بہت دیر تک الجھتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ بے جی انہیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔

”اب میں یہاں کتنا عرصہ اور رہ سکوں گی۔“ اس نے سوچا۔ پہلے یہ امید تو تھی کہ اگر بے جی نے کوئی ایسا فیصلہ کیا تو بابا انہیں اس پر عمل نہیں کرنے دیں گے۔ اور اب جب کہ وہ خود ان کے ہم خیال ہو گئے ہیں تو اس کے سامنے ڈھال کیسے بنیں گے بھلا۔ گویا جو تھوڑی بہت دل میں امید تھی وہ بھی وقت کے ظالم پنجے نے دبوچ لی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے بابا کے سامنے جانا ہی چھوڑ دیا، وہ ڈرتی تھی اسے دیکھ کر کہیں ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو ابھی بے جی کی صرف سوچ تک ہی محدود تھی۔

○ ○ ○

سر دی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوپہر میں وہ علی کو سلا کر جلدی جلدی اس کے میلے کپڑے اکٹھے کرنے لگی۔ اس نے سوچا بچے کے اٹھنے سے پہلے دھو کر ڈال دے اور ابھی وہ ہاتھ روم کی طرف جا ہی رہی تھی کہ صبیحہ ٹیلی فون لیے اس کے کمرے میں آ گئی۔

”بھابی.....! نائلہ کا فون ہے..... آپ سے بات کرے گی۔“

”اچھا.....!“ اس نے کپڑے وہیں رکھ دیے اور آکر اس کے ہاتھ سے ریسور لے لیا۔

”میں آصف ہوں۔“ اس کی ہیلو کے جواب میں کہا گیا تو اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور صبیحہ کو موجود نہ پا کر وہ بے طرح گھبرا گئی۔

”ہیلو رابعہ.....!“ آصف اسے متوجہ کر رہے تھے۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال کر بولنے پر آمادہ ہوئی۔

”نائلہ کہاں ہے.....؟“

”نائلہ بھابی.....! ابھی تو یہیں تھیں۔“ پھر ایک لمحہ توقف کے بولے۔ ”سنیں.....! میں نائلہ کی اجازت سے آپ سے بات کر رہا ہوں۔“

”کس..... کیا بات.....؟“ وہ بہت زیادہ گھبرا رہی تھی۔

”پہلے آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے کہنے لگے۔

”پلیز.....! اگر آپ نائلہ کو بلا دیں تو.....“

”نائلہ اور عاطف ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔“ انہوں نے اتنا کہا تھا کہ اس نے ریسور رکھ دیا۔ اور ابھی وہیں کھڑی کچھ قیاس کر رہی رہی تھی کہ صبیحہ دوبارہ اندر آ گئی۔

”کیا کہہ رہی تھی نائلہ.....؟“ صبیحہ کے پوچھنے پر اس نے پہلے ٹٹولنے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کوئی خاص بات نہیں کہہ کر قدم آگے کی طرف بڑھا دیا۔

کچھ دن چپ چاپ اور قدرے سکون سے گزر گئے۔ اس صبح وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سب کے اپنے اپنے کام پر روانہ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اب اس نے یہی معمول بنالیا تھا کہ جب بابا اور احتشام بھائی آفس کے لیے نکل جاتے اور بے جی اپنے کمرے میں چلی جاتی تب وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں جاتی۔ پہلے علی کے لیے فیڈر اور فارملیک بتاتی پھر اپنے لیے ناشتا۔ اس وقت بھی وہ یوں ہی اپنے خیالوں میں بیٹھی تھی کہ اسے پتا بھی نہیں چلا اور علی گھٹنوں کے بل کھسکا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کے سامنے بنی گیلری سے ہو کر وہ برآمدے میں جا پہنچا..... کھلی جگہ پر وہ بہت خوش ہوا اور خوشی کا اظہار یوں کیا کہ فرش پر زور سے ہاتھ مار کر آگے بڑھنے لگا۔ پھر ستون کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت بابا اور بے جی اپنے کمرے سے نکلے شاید ناشتے کے لیے ڈائننگ روم کی طرف جا رہے تھے کہ علی کو دیکھ کر وہیں رُک گئے۔ ایسے موقعوں پر انہیں ہمیشہ حسام یاد آیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں بہت خاموشی سے اسے دیکھنے لگے اور ابھی بے جی اس کی طرف مزید پیش قدمی کرنا ہی چاہتی تھیں کہ احتشام بھائی کا بیٹا رضا سامنے سے بھاگتا ہوا آیا اور ایک ہاتھ سے علی کو گراتا چلا گیا۔ مگر علی رویا نہیں بلکہ بہت مصومیت سے بھاگتے ہوئے رضا کو دیکھنے لگا۔

”ارے.....! وقت یوں بھی پلٹ کر آتا ہے۔“ بے جی بے اختیار ہوئیں۔ ”یہ تو احتشام اور حسام ہیں۔“ پھر بڑھ کر علی گود میں اٹھالیا۔ اور علی جو گرنے سے نہیں رویا تھا ان کی آغوش میں رونے لگا۔ پتا نہیں اسے اپنی چوٹ کا احساس اب ہوا تھا یا بے جی کی گود اس کے لیے اجنبی تھی۔ اس نے علی کے رونے کی آواز اپنے کمرے میں سنی اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلی آئی۔ سامنے بے جی علی کو بازوؤں میں بچھنے بے تحاشا پیار کیے جا رہی تھیں اور وہ رو رہا تھا بابا پر نظر پڑی تو وہ وہیں رُک گئی۔ انہوں نے اسے رُکتے ہوئے کن اکھیوں سے دیکھا پھر بے جی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ شاید ماما کا سارا خزانہ اسی وقت لانے کے موڈ میں تھیں۔

”شاید آخری ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔“ انہوں نے سوچا اور ایک دم تیور بدل کر زور سے چلائے۔

”رابعہ لے جاؤ اس بچے کو صبح ہی صبح راستے میں کھڑا ہوا ہے۔“

بے جی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ آئی۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ.....!“ بے جی نے پچاس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

”میں اب ان دونوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا انہیں کہیں اور بھیج دیں۔“

”کہاں..... کہاں جائے گی یہ.....؟“

”کہیں بھی..... یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر بغیر تاشہ کیے آفس کے لیے نکل گئے۔

اپنے تئیں وہ بے جی کو سوچنے کا وقت دے گئے تھے اور خیال تھا جب شام میں واپس آئیں گے تو بے جی احتجاج کریں گی اور اس کے حق کے لیے لڑیں گی۔ جواب میں وہ بڑے رے رے سے کہہ دیں گے۔ میں اسے یہاں رہنے کا حق دیتا ہوں آپ اسے ڈھنگ سے زندہ رہنے کا حق دیں۔ اپنے ذہن سے یہ بات نکال دیں کہ وہ بیوہ ہے تو زندگی پر اس کا حق نہیں رہا۔

لیکن رات میں جب بے جی فراغت سے ان کے پاس بیٹھیں تو بڑے آرام سے بتایا۔

”میں نے رابعہ کو علی سمیت پچھلے کوارٹر میں منتقل کر دیا ہے۔“

”کیا.....؟“ باوجود کوشش کے وہ اپنی حیرت چھپانہ سکے۔

”آپ ہی نے تو کہا تھا۔“ سارا الزام ان کے سر رکھ کر آخر میں کہنے لگیں۔

”مجھے خود اس کا یہاں رہنا کھٹکتا تھا۔ ہر وقت یہ خوف کہ کہیں اس کی نحوست پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے اور۔“ بے جی کہے جا رہی تھیں اور وہ اپنے جال میں خود پھنس کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے گئے۔

پہلی بار بے جی کے رویے پر گھر میں دبا دبا سا احتجاج جاگا تھا۔ اور اب سب بے جی اور بابا کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

”رابعہ اسی گھر کی فرد ہے۔ اسے وہاں کیوں منتقل کیا.....؟“ احتشام بھائی کی آواز اونچی تھی۔

”اگر آپ اسے محبت و شفقت نہیں دے سکتے تو آپ اس سے ایسا سلوک کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔“ انعام نے کہا۔

”ہم اس کے ساتھ یہ نا انصافی اور زیادتی برداشت نہیں کر سکتے۔“ صبیحہ کہنے لگی۔

”اے ابھی اسی وقت یہاں لے کر آئیں۔“ احتشام بھائی نے کہا۔

”میری آواز ان آوازوں کے ساتھ ہونی چاہیے تھی۔“ بابا نے سوچا اور سر جھکا لیا۔

”چلیں بے جی اسے لے کر آئیں۔ وہ ہمارے بھائی کی عزت ہے۔“ بابا کو سر جھکاتے

دیکھ کر احتشام بھائی بے جی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”وہ اپنی مرضی سے وہاں منتقل ہوئی ہے۔“ بے جی اطمینان سے بولیں۔ لہجہ کا یقین بتا رہا

تھا کہ انہوں نے یہی بات رابعہ کو بھی سمجھا دی ہوگی۔

”ہم پوچھتے ہیں رابعہ سے۔“ سب ایک ساتھ بولے ”پوچھ لو۔ لیکن کیا تم لوگوں کو میری

بات کا یقین نہیں ہے؟“

”بات یقین کی نہیں ہے۔ ہمیں اس سے پوچھنے دیں کہ وہ وہاں کیوں گئی ہے۔“

”جاؤ اپنی تسلی کر لو۔“ وہ سب کمرے سے نکل کر رابعہ کی طرف چل پڑے۔ پچھلے لان کے

بانئیں طرف آخری سرے پر چار کوارٹر لائن سے بنے تھے۔ صرف ایک میں خانماں اپنے بیوی

بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ باقی تین خالی تھے اور ان خالی کوارٹروں میں سے ایک میں روشنی دیکھ کر وہ

سب بے دھڑک اس میں داخل ہو گئے اور وہ ان کی آمد سے بے خبر علی کو تھکے ہوئے گنگنا بھی رہی

تھی۔ شاید کوئی لوری۔

آ جا ری نن دیا تو آ کیوں نہ جا

منے کو میرے سلا کیوں نہ جا

اس کے ہونٹوں پر مسکان تھی اور چہرے پر اطمینان۔ وہ سب سوالیہ نظروں سے ایک

دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر بڑھ کر ایک دم اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

”ارے.....!“ وہ اٹھنے لگی کہ صبیحہ نے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”آپ علی کو سلا لیں۔“

”یہ سو گیا ہے۔“ اس نے علی کو چادر اوڑھائی اور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”آپ سب کیسے آئے.....؟“

”تمہیں یہاں آنے پر بے جی نے مجبور کیا ہے.....؟“ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے احتشام بھائی پوچھنے لگے۔

”نہیں تو.....“

”پھر.....؟“

”میں خود ہی آئی ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو رابعہ میں جانتا ہوں بے جی.....!“

”بے جی کو الزام نہ دیں احتشام بھائی۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر فوراً بولی۔

”اصل میں گھر میں آنے جانے والی خواتین مجھے موضوع ضرور بتاتی ہیں۔ پھر ترس اور ہمدردی کی آڑ میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو جاتی ہیں جو میرے لیے مزید دکھ کا باعث بنتی ہیں اس لیے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔“

”میں گھر میں سب کا داخلہ بند کر دوں گا۔ لیکن تم یہاں نہیں رہو گی۔“

”نہیں بھائی، لوگوں سے کٹ کر نہیں رہا جا سکتا اور ایسی صورت میں تو اور بھی مشکل ہے کہ نہ بے جی کا کوئی ہے اور نہ بابا کا جب کہ اس گھر میں بیابنے والے ابھی دو فرد ہیں۔ لوگوں کا آنا جانا رہے گا تو کہیں بات بنے گی ناں۔“

”تم.....!“ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ وہ بول پڑی۔

”میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں بہت آرام سے ہوں اور یقین کریں جب لوگ مجھے موضوع بتانا چھوڑ دیں گے تب میں وہیں آ جاؤں گی۔“

”تو اب تم نہیں چلو گی۔“

”مجھے یہیں رہنے دیں۔“ وہ اتنی منت سے بولی کہ احتشام بھائی، انعام اور صبیحہ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ دونوں کیا کہتے۔ جب وہ ان ہی کی بات نہیں مان رہی تھی۔

”بہر حال..... تم کچھ بھی کہو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئیں اور میں اپنے طور پر یہ بات معلوم کر کے رہوں گا۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے انعام اور صبیحہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود ان سے پہلے ہی باہر نکل گئے۔

”آپ انتہائی بزدل خاتون ہیں۔“ انعام نے کہا اور صبیحہ کا ہاتھ پکڑ کر احتشام بھائی کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کچھ دیر تک ان کے قدموں کی آوازیں سنتی رہی پھر چارپائی سے اتر کر کمرے سے

نکل آئی چھوٹا سا چوکور آگن جس کے گرد اس کے قد سے ذرا اونچی چادر یواری تھی اور درمیان میں ایک دروازہ اس نے بڑھ کر دروازہ بند کیا پھر اس سے کمر لیک کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا سا سر اونچا کر کے دیکھا۔ اوپر کھلا آسمان تھا اور تک پھیلا ہوا، جس کے سینے پر جگمگاتے ستارے اسے اپنا مذاق اڑاتے گئے۔

”تم جھوٹی ہو..... تم جھوٹی ہو۔“

”ہاں.....! میں جھوٹی ہوں۔“ اس نے دکھ سے اعتراف کیا اس لئے کہ میں نے اپنی زبان بے جی کے پاس دان رکھ دی ہے۔ اس جھوٹی پناہ گاہ کے عوض۔“ اس کی آنکھوں میں سیلاب اتر آیا اور اب بند باندھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے شاید صبح ہی سے اپنے آپ کو رونے سے باز رکھا ہوا تھا۔ جانتی تھی ان بہن بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی ادھر ضرور آ نکلے گا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی روئی روئی سی آنکھیں اس کے جھوٹ کا بھرم رہنے نہ دیں اور اب ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ خوب روئی یہاں تک دل ٹھہر سا گیا۔

”یہاں زندگی بہت دُشوار ہو گی۔“ بے جی نے کہا تھا۔ شاید بے جی نے وہ دُشواریاں نہیں دیکھیں جن سے گزر کر میں یہاں تک آئی ہوں۔ اس نے سوچا تھا اور اب وہ ان دُشوار یوں میں موازنہ کر رہی تھی۔

ابا کا نشے میں حواس کھو کر چننا چلانا، گالیاں پھرا کر مارنا، فراز کو چھین لینے کی دھمکی اور امی کا ان دونوں بہن بھائی کو چھپاتے خود مٹی میں جا چھپنا اور پھر اس دوسری عورت کا سلوک۔ اس گھر کی کوئی یاد، کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں تھا جسے وہ دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھتی کہ کبھی جو عہد رفتہ کو آواز دے تو وہ لمحہ بھاگا چلا آئے اور یہاں کچھ وقت کے لیے ہی سہی قدم قدم پر اس کے لیے چاہت کے موتی نکھرے ضرور تھے۔ اور ایک نہیں بے شمار لحاظ جو حاصل زیست تھے جن کے سہارے وہ اپنی عمر تمام کر سکتی تھی اور پھر علی ایک اصول تحفہ، جو شاید قدرت نے اس کی دل بستگی کے سامان کے طور پر اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

”میں ان راہوں سے باسانی گزر سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔

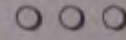
”یہ راستے پر خار ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ پاؤں لہو لہان ہو جائیں۔“

علی نیند میں رونے لگا تھا۔ وہ چوکی اور بھاگتی ہوئی اندر گئی۔ اس کے قریب پہنچی تو وہ دوبارہ سوچا تھا۔

”تو اپنے وقت کا بادشاہ ہے۔“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی بڑبڑائی اور پھر اس

کے برابر لیٹ گئی۔ کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تو زندگی خود بخود معمول پر آگئی۔ ویسے بھی اب اسے ملال سے زیادہ اطمینان تھا کہ خضر حیات نے اسے رہنے کو جگہ تو دی۔ ورنہ اگر وہ اسے گھر سے ہی نکال دیتے تو وہ کیا کر لیتی اور کمال تو یہ تھا کہ اسے اطمینان نصیب ہوا تو خضر حیات کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس طرح ہو جائے گا۔ وہ تو اسے ڈھنگ سے زندہ رہنے کا حق دلانا چاہتے تھے کہ انجانے میں جو تھوڑا بہت حق تھا، وہ بھی چھین گئے۔ انہیں کسی پل قرار نہیں تھا۔ یہی سوچتے رہتے کہ روز حشر حسام کو کیا منہ دکھائیں گے کہ وہ ہستی جسے وہ جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا تھا، اس کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا۔

”کیا ہی اچھا ہوتا جو میں ہمیشہ کی طرح اب بھی ہر معاملے سے لاتعلقی رہتا۔“ آخر میں وہ یہی سوچتے ہوئے اپنے آپ کو ملامت کرتے تھے۔



نانکہ بڑے دنوں کے بعد آئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح بے جی سے مل کر وہ رابعہ کو پکارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ جب صبیحہ ایک دم اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”بھابی یہاں نہیں ہیں۔“

”پھر.....؟“

”بڑی عزت دی ہے ہمارے ماں باپ نے انہیں۔ آئیے میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔“ صبیحہ طنزیہ لہجے میں کہتی ہوئی اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چل پڑی۔

”یہاں.....!“ کوائر کے سامنے رگ کرنا نلکہ زور سے چیخی۔

”جی جناب.....!“ ایک مل اونر کی بہو جو بقول بے جی کے دھوا ہو چکی ہے، وہ آج کل یہاں قیام پذیر ہے۔“

نانکہ اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی، اور جب اندر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تب بھی کتنی دیر تک غیر یقینی کیفیت میں کھڑی رہی تھی۔

”ٹینوٹاں.....!“ وہ محبت سے اصرار کرنے لگی۔

”یہاں تو کیا، میں کہیں بھی نہیں بیٹھوں گی۔“ نالکہ وہیں سے پلٹ گئی، اور سیدھی بے جی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”میں جا رہی ہوں بے جی.....!“

”ارے.....! ابھی تو آئی ہو۔“

”غلطی سے آگئی ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ گھر اب صرف بڑے لوگوں کا گھر رہ گیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب بھی مجھ سے پوچھیں گی بے جی.....!“ وہ تلخی سے ہنسی۔ ”جب ڈاکٹر حسام کی بیوہ یہاں نہیں رہ سکتی تو میں۔“

”نالکہ.....!“ بے جی نے ٹوک دیا۔ ”وہ اپنی مرضی سے وہاں گئی ہے۔“

”میں پھر بھی آپ کی اس بات کا یقین نہیں کروں گی۔“ زندگی میں پہلی بار اس کی آواز بے جی کے سامنے اونچی ہو گئی۔

”مت کرو میرا یقین..... اسی سے جا کر پوچھ لو۔“

”اس سے کیا پوچھوں۔ وہ تو وہی کہے گی جو آپ نے اس سے کہنے کے لیے کہا ہو گا۔“

”نالکہ.....!“ بے جی کو غصہ آ گیا۔ لیکن اس نے پرواہ نہیں کی۔

”آپ نے اپنا اعتبار، اپنا وقار کھو دیا ہے بے جی۔ میں یہاں ایک پل نہیں رک سکتی۔“

وہ جانے کے لیے پلٹ گئی۔ پھر دروازے میں رک کر بولی۔

”کبھی رابعہ کی جگہ مجھے یا صبیحہ کو بھی رکھ کر سوچ لیجئے گا۔“

بے جی کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔ جبکہ وہ ہیر چمکتی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی تھی۔ وہ

بے جی کے لیے سوچوں کے درکھول گئی تھی، جن میں قدم رکھتے ہی وہ بڑی دور تک نکل گئی۔ گو کہ

انہوں نے بہت کوشش کی تھی، کہ قدم وہیں رکھیں، جہاں رابعہ تھی، لیکن ہر بات جیسے اختیار سے باہر

ہو گئی۔ جہاں قدم رکے، جہاں دستک کو ہاتھ بڑھا۔ وہ دروازہ ہی اور تھا، جس نے کھلتے ہی انہیں

اندر گھسیٹ لیا، اور ایسی بھول بھلیوں میں لاپنچا۔ کہ وہ ابھتی چلی گئی تھیں۔

ماتا جی، پتا جی، راجیش بھیا اور ایک نئی ذہن کے کیونوس پر ابھرا آیا تھا۔

بوسیدہ سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی رمناسوی جن کی سانولی رنگت میں زردیاں کھلی تھیں۔ پڑی زدہ

ہوٹ ایک دوسرے پر یوں جھے رہتے جیسے کسی نے سی دیے ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں کہ جتھیں

دیکھ کر دشت کی ویرانی کا خیال آئے۔

”موسی.....!“ بوسیدہ ساڑھی کا آٹھل کھینچ کر اسے متوجہ کرتی ہوئی چھوٹی سی پوجا۔

”تجے آگن میں ٹنگے پڑ چلتی ہو، تمہارے پیر نہیں جلتے.....؟“ موسیٰ کا سر نشی میں ہلتا۔

”کیوں موسی.....!“

”جب من جلتا ہو تو کسی اور جلن کا احساس نہیں ہوتا۔“
 ”تمہارا من کیوں جلتا ہے.....؟“ وہ معصومیت سے پوچھتی۔
 ”تم کیا جانو گی۔“
 ”تم بتاؤ ناں۔“ وہ اصرار کرتی۔

”جب بڑی ہوگی تو خود ہی جان جاؤ گی۔“ اور بڑے ہو کر اس نے جانا کہ موہن کی چٹامیں
 کئی آگ موسیٰ کے من میں دہکتی ہے یہ بھی تو من جلتا ہے۔
 ”موسیٰ.....!“ اس نے بڑے ہو کر پوچھا تھا۔ ”تم نے من کی آگ بجھانے کی کوشش کیوں
 نہیں کی۔“

”کس کے لیے بجھاتی۔“

”کسی کے لیے بھی۔“ اس نے شیشا کر یونی کہہ دیا تھا۔

”بھئی.....!“ یہ آگ بجھاتی نہیں جاتی۔“ پھر دور خلاؤں میں نکلتے ہوئے بولی تھیں۔
 ”موہن کے بنا جیون میں رہا ہی کیا۔ وہی تو میرا ہار سنگھار تھا۔ بھاگوان ہوتی ہے وہ جتنی جس کی چٹا
 میں جتنی خود آگ لگائے اور اگر جو اس کے برعکس ہو جائے تو جتنی کی چٹا میں کئی آگ جتنی کو اپنے من
 میں سلگا لینی چاہیے، اسی میں اس کی شانتی ہے۔“
 ”کیوں موسیٰ.....؟“

”ارے تو تو نادان ہے ری..... بھلا بتا تو موہن کے بنا میں ہار سنگھار کرتی اچھی لگوں گی
 کیا؟“ اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات ”جتنی کے بغیر جتنی کا زندگی پر کوئی حق
 نہیں۔“ کچھ اس طرح نقش ہوئی کہ بدلتے وقت اور بدلتے حالات بھی اسے دھندلانے میں
 ناکام رہے۔ گو کہ اب وہ اس طرح نہیں سوچتی تھیں اب سوچنے کا انداز یوں تھا۔

”کیا راجہ کا دل چاہے گا کہ وہ حسام کے بغیر اچھی زندگی گزارے.....؟“

”کیا اس کے بغیر وہ خوشیوں میں شریک ہونے کا تصور کر سکتی ہے.....؟“

”نہیں.....! جب وہی نہیں رہا تو وہ کس طرح خوش ہو سکتی ہے.....؟“

یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی آرام سے کہہ دے یہاں سے چلے جاؤ یا جتنی سے کہہ دے دفع ہو
 جاؤ تو بات وہی ہوگی صرف انداز بدلے گا۔ یہاں بھی بنیادی سوچ وہی تھی صرف انداز بدلا تھا۔

○ ○ ○

دو ماہ میں وہ علی کو سلانے کے لیے لیٹی تو اسے خود بھی نیند آگئی حالانکہ وہ اس وقت نہیں سوتی
 تھی، اور ابھی دو ماہ پوری طرح دھلی بھی نہیں تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس بے وقت کے سونے
 نے سر بھاری کر دیا تھا، اور طبیعت بوجھل ہو گئی تھی، اس نے سوچا، چائے پیئے سے شاخ سر کا بھاری
 پن زور ہو جائے۔ علی کو دیکھا، وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے نکلی اور کچن
 میں آکر چائے بنانے لگی۔ جب تک پانی کھولا، اس نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ پھر ابھی وہ کپ میں
 چائے اٹھیل ہی رہی تھی کہ علی کی زوردار جھج سے کپٹی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ گرم گرم تھوہ اس
 کے ہاتھ اور پاؤں کو جلا گیا۔ اپنی تکلیف بھول کر وہ اندر بھاگی۔ علی سوتے میں چار پانی سے نیچے گر
 گیا تھا اور فرش پر اوندہ حال بنا بری طرح رو رہا تھا۔ اس نے بھاگ کر علی کو اٹھایا اور اپنے سینے میں چھپا
 لیا۔ اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ جتنا اسے تھکتی، وہ اتنا زیادہ روئے جا رہا تھا۔

”علی.....! علی.....!“ اسے پکارتے ہوئے بازوؤں میں لے کر اونچا کیا تو دھک سے وہ
 گئی۔ اس کی پیشانی سے خون بہتا ہوا پورے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ فوری طور پر کچھ کچھ میں نہیں آیا
 کہ کیا کرے، بس اسی طرح اسے لیے ہوئے بے جی کے پاس بھاگی۔ بے جی برا آدھے میں ٹھہری
 تھیں، اور اپنی پریشانی میں اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بے جی کے پاس بیٹھے آصف جہا تکیرا سے
 دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔

”بے جی.....! علی سوتے میں گر گیا ہے۔“ بے جی کی نظر علی پر پڑی تو وہ بھی پریشان ہو
 گئیں اور بڑھ کر اسے لینا چاہتی تھیں کہ آصف نے روک دیا۔

”میں انہیں کھینک لے جاتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر علی کی پیشانی پر
 رکھ دیا۔ پھر اجازت طلب نظروں سے بے جی کی طرف دیکھے گئے۔

”جاؤ.....!“ بے جی نے راجہ سے کہا تو وہ اسی طرح آصف کے پیچھے چل پڑی۔ تمام
 راستے علی کا روتا جاری رہا، وہ پریشان ہوتی رہی اور وہ اسے حوصلہ دیتے رہے۔ کھینک کے سامنے
 گاڑی روک کر جب وہ اترے تو اس کی گود سے علی کو لے لیا۔

”کیا ہوا؟“ کٹر صاحب.....!“ سسٹرن نہیں دیکھ کر بھاگی آئی۔ وہ راجہ کو دھیں رکنے کا کہہ
 کر علی کو لیے ہوئے ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر تک وہ کھڑی علی کے رونے کی آواز سنتی
 رہی۔ جب وہ چپ ہو گیا جب وہ طویل سانس لینے ہوئے وہیں ٹٹپا پڑ گیا۔ دیوار سے سر ٹکا یا تو
 نھریں سامنے کی دیوار پر فاصلے سے گکے کیلنڈر پر بھٹکنے لگیں۔ گول منول بچہ اور نیچے کھٹا
 ”آسٹر ملک“ پھر بچے کے لیے بھرتی غذا ماں کا دودھ۔ نھریں آگے بڑھیں تو فوری تو انا کی کے
 لیے کھینک لیں اور آگے رہا کو نوشی صحت کے صعر ہے۔ اس کے بعد دروازہ اور دروازہ کی پیشانی

پر لکھاؤ اکثر آصف جہانگیر۔

”ڈاکٹر آصف جہانگیر.....!“ ہونٹوں نے بے آواز جھنجش کی، اور ساتوں سے ان کی آواز نکرائی۔

”ارے.....! آپ یہاں بیٹھی ہیں۔“ وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی، پھر فوراً اٹھ ہوئے پوچھا۔

”علی کہاں ہے.....؟“

”سسر کے پاس ہے، آپ آئیے میرے ساتھ۔“ انہوں نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے دروازے پر وہ ان کا نام دیکھ رہی تھی۔

”میں علی کو دیکھ لوں۔“

”آپ کو دیکھ کر وہ چل جائے گا۔ پھر سسر کو ڈرینک کرنے میں دشواری ہوگی۔“ اس نے کچھ دیر سوچا، پھر ان کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سب ٹھیک ہے۔“ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس انداز سے کہا، جو ڈاکٹروں کا مریضوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

”چائے یا.....!“ اپنی کرسی پر بیٹھے تو پوچھنے لگے۔

”نہیں شکریہ.....!“ اس کا سارا دھیان علی کی طرف تھا۔

”چائے پی لیں، اعصاب پر سکون ہو جائیں گے۔“

اس کا جواب سنے بغیر انہوں نے تیل بجا دی۔ ملازم کے آنے پر اسے چائے کے لیے کہا، پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلے پریشان تھی، اب نروس بھی لگ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کی طرف دیکھنے سے باز رکھتے رکھتے بھی اس کا تفصیلی جائزہ لے گئے۔ اچھی تو وہ پہلے ہی روز لگی تھی، اور اب دل چاہ رہا تھا۔ اس کی سیدھی شفاف ماگ کو ڈھیر سارے ستاروں سے سجادیں۔

ملازم چائے لے آیا تو انہوں نے پوری ٹرے اس کی طرف کھسکا دی، اور خود لا تعلق نظر آنے لگے، پھر جب اس نے کپ ان کی طرف بڑھایا تب وہ متوجہ ہوئے اور اس کے ہاتھ پر نظر پڑی تو پوچھنے لگے۔

”آپ کا ہاتھ کیسے جلا.....؟“

”چائے سے.....“

”ابھی.....“

”نہیں گھر میں۔“ مختصر جواب دے کر اس نے اپنا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ کچھ

دھنکس کی طرف دیکھتے رہے پھر اٹھ کر الماری سے ایک ٹیوب نکال لائے۔

”لائیے۔! ٹیوب لگا دوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک نہیں ہے۔ ہاتھ ادھر لائیے۔“ انہوں نے قدرے رعب سے کہا تو اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا، اور اپنے ہاتھ کی پشت کو خود دیکھنے لگی۔ شاید سوچ رہی تھی، کہ اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھائے یا نہیں۔ اچانک جلن کا احساس ہونے لگا۔ تو اس نے مٹھی بند کر لی۔

”اس طرح تکلیف کم نہیں ہوگی۔“ انہوں نے کہا، پھر اس کی کلائی تھام لی۔ پہلے روئی بھگو کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ صاف کیا، پھر اسی نرمی سے ٹیوب لگانے لگے۔

”بینڈ ج کر دوں.....؟“ وہ قریب ہی کھڑے اس کے ہاتھ پر جھکے ہوئے تھے، اور انگلی کی مدد سے ٹیوب پوری جلد پر پھیلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہی لہجہ، وہی انداز جیسے اس نے کہا تھا۔ ”ڈرپ لگا دوں۔“

”نہیں..... میں مسلسل لینے لینے تھک جاتی ہوں۔“ وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”ارے.....!“ وہ ہنسنے لگی۔ ”یہ تو بس دومت کا کام ہے۔ اور لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس بیٹھیے۔“

”سوری.....!“ میں کچھ غلط کہہ گئی۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ اور ان کے ہاتھوں میں سے اپنا ہاتھ نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ چائے پی لیں۔ میں آپ کے بیٹے کو دیکھتا ہوں۔“

وہ جان بوجھ کر اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔ اسے واقعی چائے کی بڑی شدید خواہش تھی۔ اس کے باوجود اس نے کپ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور ان کے پیچھے جانے کو تھی کہ وہ علی کو لے کر آ گئے۔

”چلیں.....!“ علی کو ان کی گود سے لیتے ہوئے، وہ فوراً جانے کی بات کرنے لگی۔

روکنے کا نہ کوئی اختیار تھا نہ کوئی حق لیکن خواہش ضرور تھی کہ کچھ وقت ان کے سامنے بیٹھے کچھ نہ کہے لیکن سننے اور پھر سوچنے پر آمادہ ضرور ہو، اور اپنی خواہش کی تکمیل انہوں نے یوں کی کہ واپسی میں اپنے گھر لے آئے۔

”ارے.....!“ نائلہ اسے دیکھ کر زور سے چیخی، انداز میں حیرت اور خوشی تھی، جبکہ وہ اپنے

آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔

”یہ آپ دونوں ماں بیٹے کو کیا ہوا.....؟“ نائلہ نے علی کی پیشانی اور اس کے ہاتھ کی طرف

”نائلہ.....!“ آصف نے ٹوکا۔ ”میرا خیال ہے پہلے انہیں بٹھانے کی بات کرو۔“

”سوری.....!“ نائلہ شرمندہ ہوئی، پھر اسے لیے ہوئے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

”نائلہ.....! مجھے فوراً واپس چھوڑ آؤ۔“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگی۔

”کیوں.....؟“

”بے جی کو چتا چلاتو.....“

”آپ بے جی سے کہہ کر نہیں آئیں۔“

”نہیں..... یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ.....“

”ارے ہاں.....!“ نائلہ درمیان میں بول پڑی۔ ”آخر یہ سب ہوا کیسے.....؟“ اس نے علی کے گرنے کا بتایا اور آخر میں کہنے لگی۔

”اتفاق سے بے جی کے پاس ڈاکٹر آصف موجود تھے، وہ ہمیں اپنے کلینک لے گئے۔ علی کی بینڈیج کی اور پھر گھر لے جانے کی بجائے یہاں لے آئے۔“

”یہ بھی گھر ہی ہے۔“ نائلہ نے پوری بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”گھر تو ہے لیکن بے جی انتظار میں ہوں گی۔“

”میں انہیں فون کر دیتی ہوں کہ آپ یہاں میرے پاس ہیں اور بمعہ علی کے خیریت سے ہیں۔“

”نہیں نائلہ پلیز.....! تم بے جی کو جانتی تو ہو۔“ وہ رد ہانسی ہو گئی۔

”بے جی نے آپ کے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔ میں خود آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”انہیں الزام نہ دو۔ اپنے لیے یہ راستہ میں نے خود منتخب کیا ہے، ورنہ انہوں نے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا کوشش کی تھی، کیا انہوں نے آپ کو بتایا تھا کہ۔“ نائلہ کی بات ہونٹوں میں رہ گئی کیونکہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر آصف جہانگیر اندر چلے آئے، ان کے پیچھے ملازم مڑالی دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔

”ارے.....!“ نائلہ کو ایک بار پھر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ”میں ابھی آ رہی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا، اور مڑائی کھینچ کر نائلہ کے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”کلینک میں انہوں نے چائے پونہی چھوڑ دی تھی، اس لیے میں انہیں یہاں لے آیا۔“

”صرف چائے پلانے۔“ نائلہ ان کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی تو وہ کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے، جو نائلہ کی شریر مسکراہٹ دیکھتے ہوئے بھی لا تعلق سی بیٹھی تھی۔

”پتا ہے رابعہ.....!“ نائلہ نے اسے نام سے مخاطب کیا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں شاید سرزنش بھی تھی۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے نائلہ اپنی کہنے لگی۔

”آصف بھائی مجھے بہت گائیڈ کرتے ہیں۔ تم تو جانتی ہو، گھر کے معاملوں میں، میں بالکل معزوری ہوں۔ ابھی بھی مجھے خیال نہیں آیا چائے کا۔ لیکن آصف بھائی۔“

”آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔“ آصف نے کہا، اور چائے کا کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”لیجیے..... نائلہ کے آسرے پر رہیں تو یہ چائے ٹھنڈی کر کے ہی آپ کو دے گی۔“ اس نے خاموشی سے کپ تمام لیا۔ پھر ابھی یہ تینوں چائے پی رہے تھے کہ عاطف آ گیا۔ اس کے ساتھ جانے کوں تھا۔ جو رابعہ کو دیکھ کر دروازے ہی میں رک گیا۔

”آؤ بھئی..... رُک کیوں گئے.....؟ نائلہ نے اسے بلایا، پھر رابعہ سے کہنے لگی۔

”رابعہ.....! یہ فراز ہے عاطف کا کزن۔ ابھی حال ہی میں یونیورسٹی میں اس کا تقرر ہوا ہے۔ صبیحہ سے اس کے بارے میں پوچھنا۔ وہ اس کی اسٹوڈنٹ ہے۔“

پھر سرگوشی میں بولی۔ ”آصف بھائی اسی کے سلسلے میں بے جی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ صبیحہ کے لیے۔“

”وہ ایک دم سراٹھا کر فراز کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

”اور فراز، رابعہ کا تعارف کچھ یوں ہے کہ یہ پہلے بھی میری بھابی تھی اور آئندہ بھی میری بھابی ہوگی۔“

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نائلہ نے آصف کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اتنی نادان نہیں تھی۔ اس کا مطلب سمجھ کر زرد پڑ گئی اور اس کے رنگ بدلتے چہرے نے آصف جہانگیر کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں کھینچ دی تھیں۔

”نائلہ.....! اب میں چلوں گی۔“ اس نے خالی کپڑے میں رکھا اور کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سوئے ہوئے علی کو اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”ارے..... آپ تو واقعی جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔“ عاطف حیران ہوا پھر کہنے لگا۔

”اطمینان سے بیٹھیں۔ میں اور نائلہ آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“

”میں پھر بھی آ جاؤں گی۔ ابھی بے جی علی کے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی، اس لیے مجھے جانے دیں۔“

”یہ آپ کا بچہ ہے.....؟“ کوئی بات تو تھی کہ فراز بے اختیار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”جی.....!“

اسی بے اختیاری سے اس نے بھی علی کو اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس کے ہاتھوں سے لینے ہی فراز نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھے گئی۔ اس کے بازوؤں میں اس کا بچا ہی سکون سے سو رہا تھا۔ اسے کسی انجانے احساس نے آ گھیرا۔ جیسے علی کی جگہ وہ خود اتنی چھوٹی سی ہو گئی ہو۔ اور..... اور..... وہ گھبرا گئی، اور پلٹ کر نالکہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”کیوں عاطف.....! چلیں رابعہ کو چھوڑنے۔“ نالکہ، عاطف سے پوچھنے لگی۔

عاطف اٹھا، پھر فراز کو رکھنے کا کہہ کر ان سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا۔ اس نے فراز کی گود سے علی کو لیا اور قدم بڑھانے سے پہلے بولی۔

”ڈاکٹر آصف.....! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے۔“ انہوں نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جس سے وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی، اور جلدی سے باہر نکل آئی، نالکہ کا خیال تھا وہ اسے گھر کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی آئے گی۔ لیکن وہ بے جی سے کچھ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس کا خیال کر کے نالکہ کو اس کے ساتھ اندر جانا پڑا۔ بے جی اور بابا کے ساتھ احتشام بھائی اور صائمہ بھابی بھی برآمدے ہی میں موجود تھے۔ نالکہ سلام کے بعد بغیر تمہید باندھے کہنے لگی۔

”رابعہ کو آنے میں دیر اس لیے ہوئی کہ میں اسے اپنے گھر لے گئی تھی۔“

”تم.....!“ بے جی نے اتنا کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”میں اس وقت کلینک میں تھی۔ جب رابعہ اور علی آصف بھائی کے ساتھ آئے۔ اچھا اب میں چلوں گی۔“

”بیٹھو گی نہیں.....؟“ صائمہ بھابی پوچھنے لگیں۔

”نہیں بھابی.....! باہر عاطف انتظار کر رہے ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟ عاطف اندر کیوں نہیں آیا.....؟“ احتشام بھائی اٹھنے لگے تو اس نے روک دیا۔

”ہم صرف رابعہ کو چھوڑنے آئے تھے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ پلٹ گئی۔ سب نے اسے جاتے ہوئے حیرت سے دیکھا جبکہ بے جی اچھی طرح جان رہی تھیں کہ وہ اس طرح کیوں چلی گئی

”جی.....! اب علی کیسا ہے.....؟“ احتشام بھائی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستہ آواز میں کہہ کر کرن اکھیوں سے بابا کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سر ہٹکائے بیٹھنے لگی۔ اس نے سوچا اس سے پہلے کہ وہ اسے یہاں سے جانے کا کہیں، اسے خود ہی چلے جانا چاہیے..... اور وہ اسی طرح خاموشی سے وہاں سے چلی آئی۔

اپنی چھوٹی سی پناہ گاہ میں قدم رکھا تو بے تحاشا حیرت نے آن گھیرا، کمرے میں کارپٹ بچھا تھا اور چار پائی کی جگہ ڈبل بیڈ۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہیں وہ کسی دوسرے کوارٹر میں تو نہیں داخل ہو گئی۔ لیکن بقیہ چیزیں اس کے شبہ کی نفی کر رہی تھیں۔

”واہ بے جی.....! آپ کا بھی جواب نہیں۔ زخم بھی لگاتی ہیں اور مرہم بھی خود ہی رکھتی رہتی ہیں، جب صبح اس کے پاس آئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔“

”مجھے ابھی معلوم ہوا کہ علی کو کوئی چوٹ وغیرہ لگی ہے۔“

”ہاں.....! اب ٹھیک ہے، آؤ بیٹھو۔“ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو

اس نے پہلے جب تک کر علی کو پیار کیا پھر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”شام میں نالکہ باجی آئی تھیں۔ مجھ سے ملے بغیر ہی چلی گئیں۔“

”وہ مجھے چھوڑنے آئی تھی۔“ پھر اس نے بتایا کہ وہ نالکہ کے گھر گئی تھی۔ آخر میں شرارت سے کہنے لگی۔

”سنو.....! وہاں فراز بھی تھا.....؟“

”کون فراز.....؟“ صبیحہ کے انجان بننے پر وہ ہنس پڑی۔

”تم نہیں جانتیں، جبکہ نالکہ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں فراز کے بارے میں تم سے پوچھ

لوں کیونکہ تم اس کی اسٹوڈنٹ ہو۔“

”اسٹوڈنٹ تو ہوں۔ لیکن ان کے بارے میں زیادہ جانتی نہیں ہوں۔“

”تو میں کون سا تم سے ان کا شجرہ نسب پوچھ رہی ہوں۔“

”پھر.....؟“

”صرف اتنا بتا دو، کیسا ہے.....؟“

”آپ مل تو آئی ہیں، پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔“ صبیحہ مسلسل دامن پھاری تھی۔ وہ

کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”سو یا تم اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں۔“

”ارے نہیں بھابی.....! کوئی بات ہو تو کروں! اور یہ آپ جا کہاں رہی ہیں۔؟“
”چائے بنانے۔“

”چائے پینے کو واقعی دل چاہ رہا ہے لیکن آپ بیٹھیں۔ میں بتا لاتی ہوں۔“ صبیحہ اٹھنے لگی تو اس نے روک دیا۔

”تم علی کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل گئی۔
چائے لے کر آئی تو صبیحہ علی کے ساتھ لیٹی اسے آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔
”یہ اٹھ گیا تھا.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں نے دوبارہ سلا دیا۔“ صبیحہ اٹھ کر بیٹھی پھر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔

”بھابی.....!“ چائے کے دو تین سپ لینے کے بعد وہ کہنے لگی۔ ”میں واقعی فراز کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔“

”ہنگی.....! میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا تھا۔“ وہ اس کا ہاتھ دبا کر محبت سے بولی۔
”اگر آپ یہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ میرا اس کے بارے میں کیا خیال ہے تو بڑا نیک خیال ہے۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے، اور میرا خیال ہے، وہ بھی مجھے ناپسند نہیں کرتا لیکن۔“ وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔

”لیکن کیا.....؟“

”لیکن بھابی.....! میرے یا..... اس کے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوگا تو وہی جو بے جی چاہیں گی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”مجھے فراز اچھا ضرور لگتا ہے لیکن میں نے اس کے حوالے سے خواب نہیں سچائے۔ اس لیے کہ بے جی کا کوئی پتا نہیں، کب کس بات پراڑ جائیں اور میں تو نالہ باجی کے مقابلے میں بہت بزدل ہوں، جب وہ اپنے حق کے لیے نہیں لڑ سکتی تھیں تو میں تو.....“

”بھابی.....!“ انعام پکارتا ہوا آ رہا تھا۔ صبیحہ ایک دم خاموش ہو گئی، اور اسے بھی اس موضوع کو یہیں ختم کر دینے کا اشارہ کیا۔

پھر کتنی دیر تک وہ دونوں بہن بھائی اس کے پاس بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اور جب وہ اٹھ کر گئے تو اسے بھی نیند آنے لگی، اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور آ کر علی کے برابر لیٹ گئی۔ پھر بس کچھ دیر کو ہی اس کا ذہن بھٹکا تھا کہ نیند غالب آ گئی۔

صبح علی کو بخار بھی ہو گیا۔ شاید چوٹ اور پھر تکلیف کی وجہ سے اس کا بدن گرم ہو گیا تھا۔ وہ

پریشان ہو گئی لیکن فوری طور پر بے جی کے پاس جانے کی جرات نہ کر سکی۔ شاید اندر کہیں یہ خوف تھا کہ وہ کل نالہ کے گھر جانے کی تفصیل معلوم کریں گی۔ اور چھپاتے چھپاتے بھی سب کچھ صاف صاف کہہ دے گی۔ جبکہ نالہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ خود اسے اپنے گھر لے گئی تھی۔ اس کے پاس کچھ میڈیسن رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کال پول..... تلاش کر کے اسی میں سے ایک جینج علی کو پلا دیا اور سوچا اگر اس سے بخار نہ اترتا تب پھر بے جی سے کہے گی۔ گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ وہ علی کے کپڑے دھو کر ڈال رہی تھی، جب ملازمہ نے آ کر اسے ڈاکٹر آصف کے آنے کی اطلاع دی اور کہا وہ بیٹھیں دروازے پر کھڑے ہیں۔

”کیا.....؟ وہ گھبرا گئی۔“ تم انہیں بے جی کے پاس کیوں نہیں لے گئیں.....؟“

”وہ تو جی صائمہ بی بی کے ساتھ ان کے میکے گئی ہوئی ہیں۔“

”گھر میں اور کوئی نہیں ہے.....؟“

”نہیں..... اور ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے۔ وہ علی کو دیکھنے آئے ہیں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”مجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے، عجیب صورت حال تھی۔ اندر بلانا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا، اور دروازے سے لوٹنا تو انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی۔“

”پتا نہیں، وہ اسے اس کو اثر میں دیکھ کر کیا سوچیں۔“ اس نے سوچا اور ملازمہ کو کوئی جواب

دیے بغیر کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈاکٹر آصف کو کمرے کے دروازے میں کھڑا

دیکھا۔ وہ شاید اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ وہ بس ذرا سا سر ہلا سکی۔

”کیسا ہے آپ کا بیٹا.....؟“ وہ آتے ہی علی پر جھک گئے۔ کچھ دیر تک اسے چپک کرنے

کے بعد جب سیدھے کھڑے ہوئے تو کہنے لگے۔

”اسے تو بخار بھی ہو رہا ہے۔“

”جی.....!“

”کب..... رات میں ہی بخار ہو گیا تھا.....؟“

”نہیں..... رات تو یہ آرام سے سویا رہا۔ صبح میں نے دیکھا۔ اس کا بدن گرم تھا۔“

”کوئی میڈیسن دی.....؟“ وہ اس وقت خالص ڈاکٹری لہجے میں بات کر رہے تھے۔

”جی.....! میرے پاس کال پول تھی وہی دے دی۔“

”اچھا.....!“ انہوں نے کاغذ پر مزید میڈیسن لکھ کر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا، پھر کہنے

لگے۔

”زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ پھر بغور اس کی طرف دیکھ کر

بولے۔ ”میرا خیال ہے آپ کو بھی میڈیسن کی ضرورت ہے۔“
”مجھے.....“ وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”علی سے زیادہ تو آپ بیمار لگ رہی ہیں۔“
”میں علی ہی کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

”اس کے بارے میں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ یہ شام تک ہنستا کھینا نظر آئے گا۔ اس کی چوٹ بھی معمولی ہے۔ مزید ڈرینک کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ خاموش رہی تو کہنے لگے۔
”بچوں کو چوٹیں لگتی رہتی ہیں، اور وہ بیمار بھی ہو جاتے ہیں، لیکن بچے کی ماں کو ذرا حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ صحیح دیکھ بھال نہیں ہو سکے گی۔“
”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ جلدی سے کہہ گئی۔

”اچھا.....!“ وہ بے ساختہ مسکراہٹ کو روک نہ پائے۔
”آپ بیٹھیں ڈاکٹر آصف! میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“ بڑی دیر بعد اسے خیال آیا۔ تو وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”چائے پھر سہی.....“ انہوں نے انکار نہیں کیا، گویا دوبارہ آنے کا ارادہ تھا کہنے لگے۔
اس وقت کلینک جا رہا تھا۔ سوچا پہلے آپ کے بیٹے کو دیکھ لوں۔“ (تمہیں دیکھنے کی خواہش بھی شدید تھی۔)
”شکریہ.....!“

”ویسے نائلہ نے بھی بار بار تاکید کی تھی کہ میں یہاں سے ہوتا ہوا جاؤں۔ اوکے اب میں چلوں۔“ انہوں نے قدم بڑھائے تو وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتی ہوئی ان کے پیچھے چل پڑی۔
”میں شام میں پھر آؤں گا۔“ وہ دروازے کے قریب قدم روک کر ایک دم اس کی طرف پلٹ کر بولے، تو وہ بے حد خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔
”علی کو دیکھنے۔“ اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ کر گئے۔

”ڈاکٹر آصف.....!“ وہ پلٹے تو اس نے پکار لیا۔ ”اگر آپ خیال نہ کریں تو ایک بات کہوں۔“
”ضرور.....!“

”آپ یہاں آنے سے پہلے بے جی سے اجازت ضرور لے لیجیے گا۔“

اپنی بات کہہ کر اس نے فوراً رخ موڑ لیا۔ اور وہ نادان نہیں تھے۔ ایک ذرا سی بات نے ہی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی، پھر کمرے سے لے کر بیرونی دروازے تک

دیکھتے ہوئے کئی سوال ایک ساتھ ذہن پر دستک دینے لگے تھے۔ اب تک شاید انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ ”انحصار“ سے نکل کر ایک چھوٹے سے کوارٹر میں کھڑی تھی۔ دل چاہا پیچھے سے ہاتھ پڑھا کر اس کے کندھوں کو تھام لیں اور پوچھیں۔ وہاں سے یہاں تک کیونکر آئی ہو۔ لیکن ایسا کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایسا کوئی حق دینے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔
”آئی ایم سوری مسز راجہ.....!“ انہیں کہنا پڑا۔ ”بے جی گھر پر نہیں تھیں ورنہ میں اس وقت بھی ان سے اجازت لے کر ہی آتا۔“

وہ خاموشی سے ان کے قدموں کو دور جاتے ہوئے محسوس کرتی رہی، اور جب دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ تب طویل سانس لیتے ہوئے وہ بیڈ پر گر گئی۔ پھر سارا وقت وہ مختلف اندیشوں میں گھر کر اپنے آپ کو بلکان کرتی رہی۔ اسے اپنی یہ پناہ گاہ بہت عزیز تھی، اور زیادہ خوف اس کے چھمن جانے کا تھا۔ بار بار خیال آتا کہیں ڈاکٹر آصف کی یہاں آمد اس کے لیے الزام نہ بن جائے۔ اور پھر وقت کا ظالم پنجہ۔
”نہیں..... میرے خدا.....!“ اس سے آگے وہ سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

دو پہر ڈھلی تو اس نے سوچا۔ وہ ڈاکٹر آصف کے آنے سے پہلے ہی کسی بہانے بے جی کے پاس جا بیٹھے، تاکہ ڈاکٹر آصف کو یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور جلدی جلدی علی کے کپڑے بدلنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو وہیں کھڑے کھڑے ہاتھوں سے اپنے بال ٹھیک کیے، اور پھر علی کو گود میں لے کر کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ دروازے سے بے جی داخل ہوئی نظر آئیں۔ وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گئی۔
”کیسا ہے علی.....؟ انہوں نے قریب آ کر پوچھا۔“

”اب ٹھیک ہے۔ میں اسے آپ کے پاس ہی لا رہی تھی۔“
”اچھا.....!“ انہوں نے کچھ سوچا پھر کہنے لگیں۔ ”آصف اسے دیکھنے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں اندر بلا لو۔“ بے جی اس کی گود سے علی کو لے کر کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں.....؟“ اس نے دروازہ کھولا تو وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔
اس نے خاموشی سے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

”میرے ساتھ فراز بھی ہے۔“ انہوں نے کہا، تو اس کی نظر فراز پر پڑی جو ان کے پیچھے کھڑا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں کل بھی وہ اسے دیکھ کر نہ صرف بے اختیار ہوئی تھی بلکہ ایک انجانا احساس بھی جاگا تھا اور اب بھی ڈاکٹر آصف کو نظر انداز کر کے اسی کی طرف لپکتے کودل چاہ

رہا تھا۔

”آؤ فراز.....! وہ واقعی ڈاکٹر آصف کو نظر انداز کر گئی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو وہ ان کے پیچھے چلتی ہوئی اندر آئی۔

”اب تو یہ کھیل رہا ہے۔“ بے جی انہیں دیکھتے ہی علی کے بارے میں کہنے لگیں۔

”بخار تو نہیں ہے۔“ آصف نے بڑھ کر پہلے علی کا ہاتھ تھاما پھر جری کے اندر ہاتھ ڈال کر سینہ اور پیٹ چیک کیا۔

”بخار نہیں ہے اور میرا خیال ہے۔ یہ پٹی بھی کھول دیتا ہوں، بس ہلکی ہلکی ٹیوب لگا دیجیے گا۔“ وہ وہیں بیٹھ کر علی کے ماتھے پر بندھی پٹی کھولنے لگے تو وہ بے جی سے پوچھنے لگی۔

”بے جی.....! چائے لاؤں۔“

”ہاں.....! اس وقت ہم علی بابا کے مہمان ہیں اور چائے ضرور پئیں گے۔“ بے جی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فراز بول پڑا۔ تو وہ بے جی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر ان کا اشارہ ملنے پر ہی وہ چائے بنانے کے لیے کمرے سے نکلی تھی۔ کچن میں آکر اس نے چولہا جلایا۔ کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھا، اور ابھی ٹرے میں کپ رکھ ہی رہی تھی کہ بے جی اس کے پیچھے آ گئیں۔

”سنو.....! صرف چائے ہی مت لے جانا۔“

”جی.....!“ وہ کپ چھوڑ کر ریک پر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ علی کے سکٹ رنکھے ہوئے تھے۔ اس نے وہی اٹھا کر بے جی کے سامنے کر دیے۔

”میرے پاس تو یہ ہیں۔“ خلاف توقع بے جی ہلکے سے مسکرائیں۔

”میں ابھی کچھ سامان بھیجتی ہوں۔“

”بے جی آپ.....!“

”تم لڑکی نہیں ہو، بچے کی ماں ہو۔ تمہیں براعتا نظر آنا چاہیے۔“ بے جی سمجھ گئی تھیں کہ وہ انہیں روکنا چاہتی ہے۔ اس لیے اسے ٹوک کر چلی گئیں۔

”ہتا نہیں، بے جی مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔“ اس نے سوچا اور چولہا دھیمہ کر کے ٹرے میں کپ کے ساتھ پلیٹیں بھی رکھنے لگی۔ ملازمہ نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے آتے ہیں اس نے تمام لوازمات ٹرے میں سجادیے، اور اسی کے ہاتھ اندر بھیج کر خود چائے دم کرنے لگی۔ جس وقت وہ چائے لے کر اندر آئی۔ فراز نیچے کارپٹ پر بیٹھا علی کے ساتھ کھیل رہا تھا اور ڈاکٹر آصف کسی میگزین کی ورق گردانی کرتے نظر آئے۔

”علی.....!“ ان دونوں کو متوجہ کرنے کی خاطر اس نے علی کو پکارا۔

”ارے.....!“ فراز اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ نے تو اچھا خاصا تکلف کر ڈالا۔“

”اتنا زیادہ تو نہیں۔“ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ اور انہیں اپنی مدد آپ کا کہہ کر چائے بنانے لگی۔ علی گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میز کا سہارا لے کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ یہاں کیوں رہتی ہیں.....؟“ وہ بات جو ڈاکٹر آصف نے نہیں پوچھی تھی۔ فراز پوچھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا۔ آصف پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ شاید اس کا جواب سننے کے لیے۔

”بس یونہی۔“ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی، لیکن فراز کریدنے سے باز نہ آیا۔

”شاید آپ کی ساس ظالم قسم کی خاتون ہیں۔“

”نہیں..... وہ بہت مہربان ہیں۔“

”پھر اس کو خضریٰ میں کیوں ڈالا آپ کو.....؟“

”میں خود آئی ہوں۔ قدرے توقف کے بعد وہ وضاحت کرنے لگی۔ ”اصل میں گھر میں آنے جانے والے لوگ مجھے موضوع بناتے تھے، جو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے میں یہاں آ گئی۔“

”آپ کا گھر نہیں ہے.....؟“

”کون سا گھر.....؟“ وہ واقعی نہیں سمجھی اور سوالیہ نظروں سے فراز کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہی جسے میکہ کہا جاتا ہے۔“

”بے جی اور نہیں بھی، خیر چھوڑیں۔ آپ چائے پئیں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ اس نے دونوں کی توجہ چائے کی طرف دلائی اور خود علی کو گود میں لے کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

”مسز رابعہ.....!“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر آصف اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”فراز ایک لڑکی سے ملنے کی خواہش لیے میرے ساتھ یہاں تک آیا ہے۔ آپ پلیز اس کی مدد کریں۔“ ان کا اشارہ صبیحہ کی طرف تھا۔

”آصف بھائی.....! مذاق کر رہے ہیں۔“ فراز جھپٹ کر بولا تو وہ اسے دیکھتے ہوئے کچھ کھوسی گئی۔

”آپ کیا سوچتے لگیں.....؟“ آصف سمجھے، وہ ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی ہے۔

”کچھ نہیں۔“ وہ علی کو وہیں بٹھا کر اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں آکر اس نے یونہی

پوراٹ کھول دیا۔ بہتے پانی پر نظر میں جمائے وہ کچھ الجھتی چلی جا رہی تھی۔

”میں گلابا دوں گا اس کا۔“ ابا کی دھمکی آمیز اونچی آواز ”خدا کے لیے چھوڑ دو میرے فراز کو۔“ امی کی التجا۔

”فراز.....! فراز.....!“ خود اس کا اس کے برابر ہونے کے باوجود اسے اپنا آغوش میں چھپاتا۔

”کیا صرف اس کے نام میں کشش ہے۔“ اس نے سوچا۔

”نہیں.....“ اندر کہیں سے آواز آئی۔ ”مجھے اس میں اپنا آپ نظر آتا ہے۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں۔“

بہتے پانی میں ایک شیشہ ابھرنے لگی۔ جسے چھونے کی خاطر اس نے پانی کے آگے ہاتھوں کا کٹورا بنادیا۔ ایک بل میں ہاتھوں کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگا تھا۔ اور ایک نہیں کتنے ہی چہرے بنے اور مٹتے چلے جا رہے تھے۔

”رابعہ.....!“ کچن کے دروازے پر دستک دے کر ڈاکٹر آصف نے اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی، تب اندر داخل ہو کر انہوں نے تل کے نیچے اپنی ہتھیلی رکھ کر پانی کو روک دیا۔

”فراز.....!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور ان پر نظر پڑی تو سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری.....!“

ڈاکٹر آصف حیرت سے اس کی طرف دیکھے گئے۔ ان کے لیے حیرت کی بات تو تھی ہی کہ فراز بھی یہاں آنے کے لیے بہت بے چین تھا۔

”آپ اندر چلیں۔ میں ابھی آرہی ہوں۔“ وہ ان کی ہتھیلی کے اوپر تل بند کرتے ہوئے بولی۔

”اب ہمیں اجازت دیجئے۔“

”وہ آپ کے بیٹے کے ساتھ مصروف ہے۔“

”اچھا.....!“ وہ سبک اٹھی۔ ”ہم انہیں کیسے علی اس کے ساتھ اتنا مانوس ہو گیا ہے ورنہ تو وہ کسی کے پاس جاتا ہی نہیں۔“ وہ ان کے ساتھ کچن سے نکلی۔ فراز علی کو اٹھائے انہی کے پاس آ رہا تھا۔

”چلیں آصف بھائی.....!“ وہ علی کو اس کی گود میں دیتے ہوئے بولا۔

”لیکن تمہارا مقصد تو پورا ہوا نہیں۔ میرا مطلب ہے جسے دیکھنے آئے تھے۔“

”میں رابعہ اور علی کو دیکھنے آیا تھا۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ اور آصف جو اسے چھیڑنے کی خاطر بات کہہ گئے تھے۔ اس کا جواب سن کر چپ سے ہو گئے تھے۔

○ ○ ○

بے جی نائلہ کی ازدواجی زندگی کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھیں۔ جیسی تربیت انہوں نے خود اپنی اولاد کی، کی تھی۔ سسرال میں بھی اسے ویسا ہی ماحول ملا تھا۔ عاطف اور آصف دو ہی بھائی تھے، والدہ ان کی بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ والد نے دونوں کی پرورش بہت اچھے ماحول میں کی تھی۔ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت بھی اچھی ہو تو شخصیت میں خود بخود نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ دونوں بھائی زندہ مثال تھے۔

جس وقت آصف جہانگیر میڈیکل کے آخری سال میں تھے تب ان کے والد بھی اپنے مالک حقیقی کی طرف سفر کر گئے۔ گو کہ صدمہ گہرا تھا لیکن انہوں نے بہت حوصلے سے کام لے کر نہ صرف خود کو سنبھالا بلکہ عاطف کو بھی سہارا دیا۔ عاطف ان سے چار سال چھوٹا تھا اور اس وقت انٹر میں پڑھ رہا تھا۔ پھر جب آصف نے اپنی پریکٹس شروع کی تو خاندان کے زیادہ تر لوگوں نے بھی مشورہ دیا کہ وہ شادی کر لیں تاکہ گھر میں عورت کا وجود آجائے جو ان کے ساتھ گھر کی ذمہ داریاں شیر کر سکے۔ لیکن آصف کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ ان کا کہنا تھا ضروری نہیں ہے کہ آنے والی ان کی ذمہ داریاں شیر کرے وہ انہیں عاطف سے غافل بھی کر سکتی ہے..... اور وہ کسی طرح اپنے چھوٹے بھائی کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنی ذات کو نظر انداز کر کے انہوں نے صرف عاطف کے لیے سوچا۔ ایک طرح سے والد کے بعد جو ذمہ داری ان کے کندھوں پر آ پڑی تھی، اسے احسن طریقے سے نبھانے میں کامیاب ہو گئے۔ عاطف کی تعلیم اس کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور پھر نائلہ کے ساتھ شادی کہیں کوئی کمی نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی پہلو سے اسے اذہورارہنے دیا تھا۔ اور یہی بات بے جی کو پسند آئی تھی۔ ان کا خیال تھا والدین کے بغیر اکثر بچے بگڑ جاتے ہیں اور اگر بگڑتے نہیں تو تشہر و نظر آتے ہیں پھر اپنی تسکین کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرتے ہیں جسے دوسرے لوگ پسند نہیں کرتے۔ لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یقیناً ان کی رگوں میں شریف اور غیرت مند والدین کا لہو دوڑتا تھا اور پھر ان کے خاندان کے بقیہ لوگوں سے بھی بے جی کی کسی نہ کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تھی۔

سب ہی بہت سلجھے ہوئے اور روشن خیال نظر آتے تھے۔ اور اب جو اسی خاندان سے صبیحہ کے لیے فراز کا پروپوزل آیا تو بے جی کو خوشی ہوئی۔ نائلہ کی پرسکون و پر مسرت ازدواجی زندگی کے

پیش نظر انہیں فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں تھی۔ خضر حیات اور احتشام بھائی بھی اس رشتے کے حق میں تھے اور حق میں تو بے جی بھی تھیں لیکن آخری فیصلہ کرنے سے پہلے وہ نائلہ سے تفصیلی بات کرنا چاہتی تھیں شاید اندر کہیں یہ خیال تھا کہ ضروری نہیں کہ فراز، عاطف اور آصف جیسا ہی ہو۔ اور وہ نائلہ سے بات کر کے اپنا پورا اطمینان کر لینے کے بعد ہی حتمی فیصلہ کر سکتی تھی اور نائلہ بھی کہ راہِ بیکری وجہ سے ان سے خفا ہو کر آٹا ہی چھوڑ رکھا تھا۔

کئی بار خیال آیا، وہ خود نائلہ کے پاس چلی جائیں۔ لیکن یہاں اپنا وقار مجروح ہونا نظر آیا۔ شروع ہی سے اولاد کی نظروں میں انہوں نے اپنا جو مقام بنایا تھا، اسے قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے نائلہ کے پاس خود جانے کے خیال کو ہر بار انہوں نے جھٹک دیا۔ ادھر جب فراز کے والدین نے جلدی جلدی کا شور مچایا تو انہوں نے رابعہ کا سہارا لیا۔ اس شام وہ جان بوجھ کر آصف اور فراز کو اس کے پاس چھوڑ گئی تھیں اور اب اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”تم نے فراز کو کیسا پایا.....؟“ وہ حیران ہوئی۔ واقعی نہیں سمجھتی تھی کہ وہ فراز کے بارے میں اس طرح کیوں پوچھ رہی ہیں۔

”کیا خیال ہے، وہ مصیبت کے لیے مناسب رہے گا؟“ اسے شش و پنج میں دیکھ کر انہوں نے یوں بات کی۔

”آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں بے جی.....!“ وہ یہی کہہ سکتی تھی۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن میں ہر طرح سے اپنا اطمینان چاہتی ہوں۔“

”میں آپ کو کس طرح اطمینان دلا سکتی ہوں جبکہ میں نے تو اسے ایک دو بار ہی دیکھا ہے۔“ بے جی کچھ دیر تک پرسوج انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

”تم نائلہ سے بات کرو۔“

”میں.....!“

”ہاں.....! تم شام میں تیار رہنا۔ میں ڈرائیور سے کہوں گی۔ تمہیں نائلہ کے گھر چھوڑ آئے گا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”نائلہ تمہارے ساتھ زیادہ اونچ ہے اور میں سمجھتی ہوں، وہ تمہارے ساتھ زیادہ فریٹک ہو کر بات کرے گی۔“

”جی.....!“ وہ سر جھکا کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”اور سنو.....! علی کو میرے پاس چھوڑ جانا۔“ انہوں نے جاتے جاتے کہا اور کتنی دیر تک وہیں بیٹھی بے سرو پا باتیں سوچتی رہی تھی۔

”شام میں بے جی کے کہنے کے مطابق وہ تیار ہو گئی اور اس کی تیاری کیا تھی، وہی سفید راندی جو اس نے نائلہ کی شادی میں باندھی تھی۔ بالوں کی سیدھی شفاف مانگ جنہیں چوٹی میں گوندھ کر چھوڑ دیا۔ علی کو بے جی کے پاس آئی تو وہ اس کی منتظر تھیں۔ انہوں نے علی کو اس کی گودے سے لے لیا اور کہنے لگیں۔

”میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے، تم چلی جاؤ۔ اور سنو۔ امید ہے واپسی میں تمہیں نائلہ سے ملنے آئے گی۔ اسے دروازے سے واپس مت جانے دینا۔“

وہ سر ہلاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ حسام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی پروگرام کے تحت گھر سے نکل رہی تھی۔ اپنے اکیلے پن کا شدت سے احساس ہوا اور تمام راستہ وہ اس احساس سے نکل نہ پائی۔ نائلہ کے گھر کے سامنے آتے ہی تو دل نامعلوم بوجھ تلے دب چکا تھا۔ کڑی دھوپ نہیں تھی لیکن بے سائبانی کا احساس پیش سے ہٹتا رہتا تھا۔ ہوئے ترن سن جلائے دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھے صحراؤں میں نیچے پاؤں پٹی آ رہی ہو۔

ڈرائیور اسے چھوڑ کر جا چکا تھا اور شام کا وقت ہونے کے باوجود یہاں سے وہاں تک اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اسے ان اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان اپنا تنہا وجود بہت عجیب لگا۔

ایک پل کو تو اسے خود اپنے آپ پر شبہ ہوا کہ وہ اسی دنیا کی باسی ہے یا کہیں سے راستہ بھٹک کر چلی آئی ہے۔

”کم از کم علی کو ہی ساتھ لے آتی۔“ اس نے سوچا اور سیاہ گیٹ کے کنارے گلے ہٹن پر انگلی رکھ دی۔ اندر کہیں مدھم سروں میں ٹیون بجے لگی تھی۔ وہ بے خیالی میں ٹیون سے انگلی ہٹاتا بھول گئی تھی اور مسلسل بجتی تیل سے جھنجھلا کر ہی زوردار آواز کے ساتھ گیٹ کھولا گیا تھا۔ وہ چونکی اور سر

جھٹک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ گیٹ سے ملازم کا چہرہ نمودار ہوا، اور اسے دیکھ کر اس نے پورا گیٹ کھول دیا۔ وہ اس سے کوئی بھی سوال کیے بغیر اندر داخل ہو گئی اور روش پارکر کے برآمدے تک آئی

تو ملازم نے بتایا کہ نائلہ اور عاطف گھر پر نہیں ہیں۔

”ہیں.....!“ وہ کتنی دیر تک ہونٹوں کو نیم وا کیے ہونٹ بنی کھڑی رہی۔

”ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ انہیں اطلاع کروں۔“ ملازم پوچھ رہا تھا۔

”نائلہ کب تک آئے گی.....؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”ہاں نہیں جی..... آپ ڈاکٹر صاحب سے معلوم کر لیں۔“ وہ فوری جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑ گئی۔ دل چاہا کہ انہیں سے واپس پلٹ جائے لیکن ڈرائیور واپس جا چکا تھا۔ اس نے سوچا

کسی بھی طرح چلی جاؤں گی۔ یہاں رکن ٹھیک نہیں ہے۔
 ”میں چلتی ہوں۔ نائلہ آئے تو اس سے کہہ دیتا۔“ اس نے کہا اور واپس مڑنا ہی چاہتی تھی
 کہ ڈاکٹر آصف باہر آ گئے۔ اسے دیکھ کر لڑکھ بھر کو وہ ٹھٹھکے تھے۔

”آپ.....!“

”جی وہ بس.....“

”یہاں کیوں رُک گئیں.....؟ اندر آئیں ناں.....“ وہ جانتے تھے۔ وہ ان تین لفظوں کے
 آگے کچھ نہیں کہے گی پھر بھی یوں بات کی جیسے اس کی بات کاٹ گئے ہوں۔
 ”میں نائلہ سے ملنے آئی تھی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”نائلہ اور عاطف ابھی کچھ دیر پہلے نکلے ہیں۔ وہ گھر پر نہیں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے
 کہ آپ یہیں سے واپس چلی جائیں آئیے۔“
 وہ سر جھکا کر ان کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ اسے بٹھا کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد
 واپس آئے تو وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ انہوں نے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اس
 کی طرف دیکھا پھر کہنے لگے۔

”اگر آپ آنے سے پہلے فون کر دیتیں تو نائلہ اور عاطف اپنا پروگرام کنسل کر دیتے۔“

”ہاں.....! مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن خیال نہیں رہا۔“ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا
 اور اعتراف بھی کیا۔

”آپ علی کو ساتھ نہیں لائیں۔“

”وہ بے جی کے پاس تھا۔“ کچھ دیر رُک کر کہنے لگی۔ ”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔“

”چائے آرہی ہے۔“

”چائے پھر سکی۔“ وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے روک دیا اور خود اٹھ کر چلے گئے۔ واپس آئے تو
 چائے کی ٹرے ہاتھوں میں تھی۔ وہ خاموشی سے انہیں چائے بناتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر جانے کیا
 خیال آیا کہ انہی سے پوچھنے لگی۔

”فراز آپ کا کزن ہے۔“ وہ ایک دم ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگے، جبکہ وہ اپنی
 کہہ گئی۔

”اچھا لڑکا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے لیکن بے جی شاید پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”وہ مسجد کی ماں ہیں اور ظاہر ہے، اپنا پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی اس رشتے کے لیے
 باری بھریں گی۔“

”ہاں۔“ اس کی صورت انہوں نے سینے میں دبی سانس خارج کی۔ پھر اپنی جگہ سے
 اٹھ کر چائے کا کپ اسے تھمایا۔

”شکریہ.....!“ اس نے کہا اور کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”فراز آپ سے بہت متاثر ہے۔“ وہ کہنے لگے۔ ”وہ بہت دیر تک نائلہ سے آپ کے
 بارے میں پوچھتا رہا۔“

”کیا.....؟“ وہ ایک دم سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ ہاتھ جن کی پردہ پوشی کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنی مرضی سے انصر سے
 نکل کر اس چھوٹے سے کوارٹر میں منتقل ہوئی ہیں۔“

”حقیقت یہی ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”حقیقت یہ نہیں ہے راجہ بیگم.....! حقیقت وہ ہے جو نائلہ نے کہی اور اس کی تصدیق
 آپ کا سراپا کر رہا ہے۔“

”اس کے نظریں جھکانے پر کہنے لگے۔“

”بہر حال..... دکھ کی بات ہے کہ بے جی نے آپ کو زندگی کی خوشیوں سے محروم کر رکھا
 ہے۔ آپ احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ بے جی یہی کریں گی کہ آپ کو اس کوارٹر سے

بدل کر دیں گی پھر اس کے بعد دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہے کہ آپ کو کہیں امان مل سکے۔“

”میں اب چلوں گی۔“ ان کی باتوں کے جواب میں وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نائلہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ خود بزدل ہیں۔ حالات سے لڑنا ہی نہیں چاہتیں۔ ذرا سا

حوصلہ پیدا کریں۔ حالات خود بخود آپ کے تابع ہو جائیں گے۔“

”ڈاکٹر آصف پلیز.....! آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“

”وقت کے زیاں کا احساس ہے آپ کو۔“ وہ اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔

”بہت دیر ہو گئی ہے، مجھے چلنا چاہیے۔“

”پہلے ایک بات کی وضاحت کر دیں پھر جانے کی بات کریں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے ان

کی طرف دیکھنے لگی۔

”بے جی نے آپ کو یہاں تک آنے کی اجازت کیسے دی.....؟“

”کس سلسلے میں.....؟“ وہ شٹا گئی۔ فوری طور پر کوئی جواب بھی نہیں بن پڑا۔ سر جھکا کر

سازمی کے پلو کو انگلی میں لپیٹنے اور کھولنے لگی۔

”بیٹھ جائیں۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ شاید اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھانا چاہتے تھے لیکن وہ خود ہی جلدی سے بیٹھ گئی۔

”ہاں..... اب بتائیں، کیا بات ہے.....؟“

”اصل میں بے جی فراز کے سلسلے میں نائلہ سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھیں اور وہ چونکہ بے جی سے خفا ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اس سے بات کر لوں۔“

”فراز کے بارے میں بے جی کو یقین دلا دیجیے کہ وہ اسے کسی طرح بھی عاطف سے کم نہیں پائیں گی۔ گو کہ وہ چچا جان کی اپنی اولاد نہیں ہے لیکن اس کی تعلیم اور تربیت میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھارکھی، اگر چچا جان کی اپنی اولاد بھی ہوتی تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ فراز کی طرح ہوتی اس سے بڑھ کر وہ اس کی تربیت نہیں کر سکتے تھے۔“

”کیا فراز.....؟“

”ہاں.....! فراز چچا جان کا بیٹا نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔ ”کیونکہ چچا جان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے بچپن ہی میں اسے گودے لیا تھا۔“

”کس کا بیٹا ہے وہ.....؟“

”میں نہیں جانتا اور میرا خیال ہے ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔“

”کیا فراز بھی نہیں جانتا.....؟“

”کہہ نہیں سکتا، کیونکہ ہم نے کبھی اس سے اس سلسلے میں بات نہیں کی۔“

وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔ پھر ان کی طرف دیکھا وہ اسی طرح کھڑے تھے۔

”اب تو میں جاسکتی ہوں۔“ اس کے سادگی سے پوچھنے پر وہ ہلکے سے مسکرائے۔

”کیسے جائیں گی.....؟“

”کوئی رکشا یا ٹیکسی منگوا دیں۔“

”چلیے.....! میں چھوڑ آتا ہوں۔“ اس کا جواب سنے بغیر انہوں نے ملازم کو آواز دے کر اپنے جانے کا بتایا اور اسے آنے کا کہہ کر خود اس سے پہلے ہی باہر نکل گئے تو وہ طویل سانس لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے پیچھے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”بے جی تک میرا ایک پیغام پہنچا دیجیے گا۔“ وہ گھر کے سامنے اتری تو وہ اسے پکار کر کہنے لگی۔

”آج میں نے جس جگہ آپ کو چھوڑا ہے۔ کبھی وقت آنے پر یہیں سے آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آؤں گا۔“

”ڈاکٹر آصف.....!“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ آنکھوں میں حیرت، خوف اور

جانے کیا تھا۔ انہوں نے اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور

گاڑی آگے بڑھالے گئے۔ وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی ان کی گاڑی کو دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئی، تب وہ بھی اندر آگئی۔ اسے اکیلے دیکھ کر بے جی فوراً پوچھنے لگیں۔

”نائلہ نہیں آئی.....؟“

”نائلہ گھر پر نہیں تھی۔ بے جی! میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

پھر اس نے کھڑے کھڑے اپنے اور ڈاکٹر آصف کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو کہہ

سنائی۔

”فراز اس گھر کا فرد نہیں ہے.....؟“ اس کی ساری بات سننے کے بعد بے جی نے بس اتنا

کہا۔ اس کے بعد وہ انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ اور بھی کہیں گی لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

”علی کہاں ہے.....؟“ وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تو پوچھنے لگی۔

”وہ صبیحہ کے پاس ہے۔“

”میں جاؤں بے جی.....!“

”ہاں.....!“ انہوں نے اجازت دی تو وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔

صبیحہ برآمدے ہی میں علی کو گود میں لیے ٹھپکتی نظر آئی۔ اس نے وہیں سے علی کو لیا اور صبیحہ سے

معذرت کر کے وہاں سے چلی آئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ شروع کے چند دنوں میں ڈاکٹر آصف کی باتوں سے وہ

ڈسٹرب رہی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ہر خیال پس منظر میں چلا گیا۔ ویسے بھی اس دن کے بعد

سے ان کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اور وہ چاہتی بھی نہیں تھی۔ ادھر علی کچھ دنوں سے چھوٹے چھوٹے لفظ

بولنے لگا تھا جس سے اس کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ جب خوشی کا اظہار کرتے

ہوئے اس کے ہونٹوں سے ماں نکلتا تو وہ جیسے اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ کتنا معتبر کر دیا تھا اس

ایک لفظ نے اسے۔ وہ اپنے آپ کو بہت مضبوط تصور کرنے لگی۔ وہ اب صرف اس کی نہیں سنتا تھا۔ اپنی بھی کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ جس طرف جاتی، اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ کچن میں کام کرتی تو

اس کے ساتھ کھڑا ہو کر ایک ایک چیز کے بارے میں پوچھتا۔ ہر چیز کے بارے میں اس کا ایک ہی سوال ہوتا۔

”یہ کیا ہے.....؟“

اس کی آواز نے خاموشی کو توڑ دیا تھا اور اس کے ننھے سے وجود نے اکیلے پن کے احساس کو بھی مٹا دیا تھا۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔
”زندگی کی ناؤ اگر اسی طرح پرسکون دھارے پر بہتی رہے تو مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں رہے گا۔“ وہ سوچتی تھی۔

○ ○ ○

اسے ابا کے پاس گئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ مگر وہاں جا کر اور ان کی حالت دیکھ کر وہ کڑھتی ہی تھی اور دل پر بوجھ لیے ہی واپس آتی تھی۔ لیکن انہیں دیکھے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا۔ کچھ بھی سبکی بہر حال اس کے باپ تھے اور بیٹیاں تو ویسے بھی ماں باپ کے لیے نرم جذبے ہی لے کر پیدا ہوتی ہیں۔

اس دن انہیں دیکھنے کو زیادہ دل مچلا تو اس نے بے جی سے اجازت لی اور آ کر ایک بیگ میں علی کے کپڑے رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے علی کو تیار کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

باہر آئی تو ڈرائیور گاڑی لیے کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ اس میں بیٹھ گئی۔ مخصوص راستوں پر گاڑی دوڑنے لگی۔ اس نے علی کو سیٹ پر کھڑا کر دیا تھا۔ اور وہ باہر کی ہر چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ وہ کسی وقت جواب دیتی ورنہ نظر انداز کر دیتی۔ ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اور وہ جو اپنے خیال میں بیٹھی تھی، ایک دم چونک گئی۔

”کیا ہوا.....؟“ وہ ڈرائیور سے پوچھنے لگی۔

”پتا نہیں جی..... میں دیکھتا ہوں۔“

”ڈرائیور اتر گیا اور بونٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ بہت جلد بیزار ہو گئی علی بھی بسور نے لگا تھا۔ وہ اسے بہلانے کی خاطر شیشے سے باہر مختلف چیزیں دکھاتے ہوئے ان کے بارے میں بتانے لگی۔

”راجہ.....!“ دوسری طرف کے شیشے سے کسی نے پکارا تو وہ فوراً گردن موڑ کر دیکھنے لگی اور

فرار کو دیکھ کر وہ کھل کر مسکرائی۔

”کوئی پراہلم ہے.....؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”ہاں شاید.....!“ اس نے کہا تو فرار جا کر ڈرائیور سے بات کرنے لگا پھر اس کے پاس آ کر بولا۔

”کوئی بڑی خرابی لگتی ہے۔ آئیے۔ آپ میری گاڑی میں آ جائیں۔“

”ہو سکتا ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے۔“

”ویسے آپ کو جانا کہاں ہے.....؟“

”میں اپنے والد کے گھر جا رہی ہوں۔“

”آئیے..... میں چھوڑ دوں گا، آئیے پلیز.....!“

اس نے اصرار کیا تو وہ علی کو لے کر اتر آئی پھر ڈرائیور سے کہہ کر اس کی گاڑی میں جا بیٹھی۔

وہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

”بہت دنوں سے تم آئے نہیں۔“ وہ یونہی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

”آپ کی وہ بے جی جنہیں آپ نے مہربان خاتون کہا تھا۔ ان کی وجہ سے۔“

”انہوں نے تمہیں آنے کو منع کیا ہے.....؟“

”نہیں.....“

”پھر.....؟“

”وہ بہت عجیب و غریب خاتون ہیں، کچھ میں نہ آنے والی۔“ قدرے توقف کے بعد بولا۔

”ظالم سماج بھی ہیں۔ پتا نہیں آپ نے کس وجہ سے انہیں مہربان کہا تھا جبکہ خود آپ کو بھی

انہوں نے اپنی غلط روایتوں کی بحیثیت چارہ کھا ہے۔“

”نہیں تو شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ نظریں جھاتے ہوئے بولی۔

”غلط فہمی۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔ ”پلیے تو ان سے کہئے۔ میرا حسب نسب جاتے بغیر صبیحہ کا ہاتھ

میرے ہاتھ میں تھما دیں۔“

”بس یہیں روک دو۔“ اس نے گھر آنے پر شکر ادا کیا کہ وہ مزید اس کی باتیں سننے سے بچ

گئی تھی۔

”یہاں.....“ گاڑی روک کر وہ حیرت سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

”ہاں.....! میں کسی بہت بڑے باپ کی بیٹی نہیں ہوں۔“ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر وہ

اتر گئی اور وہ بھی کچھ حیران حیران سا نیچے اتر آیا۔ گاڑی سے قہقہہ لگا کر کھڑا ہوا تو سامنے ادھ کھلے

دروازے پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ وہ چکر کاٹ کر اس کے پاس آئی تو وہ کم صبر سا کھڑا تھا۔
 ”آؤ فراز! اندر چلو۔“ پتا نہیں اس سے بات کرتے ہوئے وہ اتنی شیش کیوں ہو جایا کرتی تھی۔

”نہیں۔“ وہ جیسے خوفزدہ ہوا۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گا۔ وہ میرا گھادباؤں کے۔“ اس کے ہاتھ اپنی گردن پر چلے گئے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ وہ اس کے بازو کو تھام کر پوچھنے لگی۔

”ہیں۔“ وہ چونکا اور زور زور سے سر کو جھٹکے دیئے لگا۔
 ”شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“
 ”اس نے علی کا ہاتھ تھاما اور اس سے چلنے پر اصرار کیا تو وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔

دروازے سے اندر داخل ہوئی تو سامنے سے نادر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھ کر وہیں رک گیا۔ پہلے بغور دونوں کا جائزہ لیا پھر دھاڑ کر پوچھنے لگا۔
 ”کون ہے یہ؟“ ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ کہنے لگا۔
 ”راہجہ! ایک بار تو میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ کہہ دے اپنے پیار سے یہاں سے چلا جائے ورنہ۔“

”فراز!۔“ اس نے سبھی ہوئی آواز میں پکارا اور دوسرے چل فرار نے علی سمیت اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور چانک وقت کا پھیر لٹا چلنے لگا۔

ابا کا دروازے ہی سے گالیاں دیتے آتا۔ امی سے پیسوں کا مطالبہ، پھر انہیں مارنا اور ان دونوں بہن بھائی کا ایک دوسرے کے بازوؤں میں پناہ گزین ہو کر کسی کونے میں دبک جانا۔ گزرتے وقت کا ہر پل اس کی آنکھوں اور اس کے ذہن میں واضح ہوتا چلا گیا اور راہجہ کے گرد وہ اپنے بازوؤں کا گھیرا جک کرتا گیا۔

”کیا لگتا ہے یہ تیرا جو تو اس کے ساتھ چکی کھڑی ہے۔“ نادر کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”بھائی ہوں میں اس کا۔“ وہ راہجہ سمیت اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

”بھائی!۔“ نادر نے قہقہہ لگایا۔

”ہاں بھائی!۔“ اس کا ماں جایا۔ ”پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔“ راہجہ!۔“
 تم نے بچکانا مجھے۔ میں فراز ہوں۔ تمہارا اپنا بھائی فراز۔ دیکھو وہاں کھڑے ہو کر ابانے میرا گلا

دہانے کی کوشش کی تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگا تھا۔“
 ”فراز!۔“ میرے بھائی!۔“ اس کی آنکھوں میں سیلاب اُتر اُٹھا اور ابھی پلکوں کے

بہنوں نے نہیں سمجھے کہ وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔
 ”راہجہ!۔“ راہجہ!۔“ اس نے پریشان ہو کر اسے کتنی آوازیں دے ڈالیں۔ لیکن اتنی بڑی خوشی اس کا تاواں دل سنبھال نہیں پایا تھا۔ اس نے اپنی نازک سی بہن کو بازوؤں پہ اٹھایا اور علی کو ساتھ آنے کا کہہ کر اندر چلا آیا۔

کمرے میں اماں زرینہ بیگم موجود تھیں۔ راہجہ کو ایک اجنبی کے بازوؤں میں دیکھ کر حقیقت پریشان ہو گئیں۔

”کیا ہوا ہے اسے؟“ وہی کر پوچھنے لگیں۔

”شاید بیہوش ہو گئی ہے۔“

اس نے راہجہ کو آرام سے چار پائی پر لٹایا اور خود ڈاکٹر کو لینے بھاگا۔ جب تک وہ ڈاکٹر کو لاتا۔ اماں اپنے طور پر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہیں۔ پھر ڈاکٹر نے آکر انجکشن لگایا۔ وہ بڑی بے چینی سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس دوران وہ بار بار زرینہ بیگم کو دیکھتا اور پھر اس کی نظریں چاروں طرف بھٹکتی لگتیں جیسے کسی مانوس چہرے کو تلاش کر رہا ہو۔ راہجہ پر نظر ٹھہری تو ذہن پر برسوں پہلے کا نقش وہ چہرہ جسے وقت کی گرد نے دھندلا دیا تھا۔ واضح ہونے لگا۔

”امی!۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ اس کے اوپر جھک گیا۔ بڑی محبت سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پکارنے لگا۔

”راہجہ!۔“ آنکھیں کھولو راہجہ!۔“ برسوں بعد کسی نے یوں شفقت سے پکارا تھا۔ وہ مر بھی جاتی تو اس پکار پر کچھ دن مستعار لے کر چلی آتی۔ اب تو صرف بیہوش تھی۔ فوراً آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ وہ اطمینان کا سانس لے کر مسکراتا چاہتا تھا لیکن آنکھیں چمک پڑیں۔

”فراز!۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس کے سینے سے جا لگی۔
 اماں حیران کھڑی دونوں کو بچوں کی طرف روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ ماجرا کیا ہے۔ شوکو بلا کر پانی منگوایا اور بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کر کے پانی پلایا۔ پھر فراز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”اماں.....! یہ میرا بھائی ہے فراز.....!“ اس نے کہا تو وہ ہاری ہاری دونوں کو دیکھنے لگیں۔

”امی کہاں ہیں.....؟“ وہ اس سے پوچھنے لگا۔

”تم چلے گئے تو وہ بھی چلی گئیں۔ اب تو یہ اماں ہیں۔“ اس نے زرینہ بیگم کی طرف دیکھا پھر مختصر اتمام حالات کہہ سنائے۔ گو کہ اس نے اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا ذکر نہیں کیا پھر بھی وہ بہت کچھ جان گیا تھا۔ اور پھر بھی گھر میں داخل ہوتے ہوئے تادر نے جس لہجے میں بات کی تھی، اسے سوچ کر تو اب اس کا خون کھولنے لگا تھا۔

”آپا.....! یہ اب مجھ سے نہیں بہل رہا۔“ شبو جو بہت دیر سے علی کو گود میں لیے ادھر ادھر شہلاتے ہوئے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پاس آ کر بولی۔

”لاؤ..... مجھے دے دو۔“ اس نے علی کو لیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتی ہوئی کہنے لگی۔ ”فراز ایسے بھی تمہاری بہن ہے اور سنو اس سے چھوٹی ہے۔ کمال اور ناصرفاً لبا کام پر گئے ہیں۔ شام میں آئیں گے تو ان سے مل لیتا۔“

”اور جو دروازے پر ملا تھا، وہ کون ہے۔“

”وہ تادر ہے۔“ پھر فوراً بات بدل گئی۔ ”ارے تم ابا سے تو ملے نہیں، آؤ ابا کے پاس چلے ہیں۔“

وہ چار پائی سے اتر آئی تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو ابا اپنے مخصوص کونے میں بیٹھے نظر آئے۔ وہ قدم روک کر ان کی طرف دیکھے گیا۔

”بھئی ہے وہ شخص جس کے ظالمانہ سلوک نے مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔“

”میں اپنی ماں اور بہن کو بے آسرا چھوڑنے کا گناہ گار ہوا۔ میری ماں میری راہ تکتے تکتے مٹی میں جا ملی اور بہن حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنے کو تنہا رہ گئی۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔“ سوچتے ہوئے گئے دونوں کا عکس اس کی آنکھوں میں جھلما رہا تھا۔

”فراز.....!“ وہ اس کا بازو ہلا کر بولی۔ ”آؤ تاں.....“

”مجھے اس شخص سے ملنے کو مت کہو راجہ.....! میں اس سے۔“

”فراز.....!“ اس نے ٹوکا۔ ”مئے دنوں کی باتیں مت کرو۔ اور پھر اپنے کیے کی سزا وہ خود ایک مدت سے بھگت رہے ہیں۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ اس گھر کے مالک ہونے کے باوجود ایک کونے میں پڑے ہیں۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔ اور سنو میرے بھائی اتم اپنا دل بڑا رکھو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ امی ہمارے بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔ اور بڑا آدمی وہ نہیں ہوتا جو

اپنے عملوں میں رہتا ہو، اور جس کے پاس ڈیڑھ ساری دولت ہو۔ بڑا وہ ہوتا ہے، جس کا دل بڑا ہو۔ آؤ انہیں یقین دلا دو کہ وہ اکیلے نہیں رہے۔ تم ان کے بڑھاپے کو سہارا دینے آگئے ہو۔ یقین کرو۔ تمہارے اس اقدام سے امی کی روح کو بہت سکون ملے گا۔“

وہ جب چھوٹی تھی، جب بھی اپنی باتوں سے اسے رام کیا کرتی تھی۔ اب بھی اس کے دل اور ذہن کو گرفت میں لے لیا کہ وہ بے اختیار آگے بڑھا اور ابا کے کمرے کو اپنے بازوؤں میں سمٹ لیا، پھر وہ انہیں یقین دلا رہا تھا کہ اب وہ اکیلے نہیں رہے، وہ ان کے بڑھاپے کو سہارا دینے آگیا ہے۔ پہلی بار اس گھر میں ایک خوشگوار سی لپٹل جاگتی تھی۔ سب ہی خوش تھے۔ زرینہ بیگم کے رویے میں تو اسی وقت چلک پیدا ہو گئی تھی جب راجہ نے اس گھر کو چھوڑا تھا۔ اب وہ صرف اپنے مسائل کا رونا روتی تھیں بہر حال اس وقت وہ بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں اور شبو جو کے ساتھ مل کر دوپہر کے کھانے کا خاص اہتمام کر رہی تھیں۔ تادر البتہ خوش نہیں تھا اور کیونکہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس لیے گھر سے ہی نکل گیا۔ اور فی الحال اس کے جانے کی کسی کو پرواہ بھی نہیں تھی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے اور وہ دونوں بہن بھائی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کو ان درمیانی ماہ و سال کا احوال سناتے گئے۔ فراز نے اپنے بارے میں بتایا۔

”میں جب یہاں سے نکلا تو بہت خوفزدہ تھا بس یہی خیال کہ ابا مجھے مار ڈالیں گے مجھے یہاں سے بہت دور لے گیا، میں راستوں سے واقف نہیں تھا بس بھاگتا چلا گیا۔ پھر رات ہو گئی ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں بھی تھک گیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھا تو وہیں سو بھی گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو رجن صاحب کے گھر تھا۔ رات کو جانے کس وقت وہ مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ پھر انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاؤں، لیکن میں اتنا خوفزدہ تھا کہ کبھی بتا کے نہیں دیا۔ بس یہی خیال آتا اگر میں بتاؤں گا تو یہ مجھے واپس چھوڑ آئیں گے اور پھر ابا مجھے مار ڈالیں گے۔ یوں میں انہی کے گھر رہنے لگا۔ ان کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے ہی اپنی اولاد سمجھ لیا۔ لیکن راجہ میں کبھی تمہیں اور امی کو نہیں بھولا۔ جب بڑا ہوا اور ابا کا خوف بھی نہیں رہا۔ تب میں نے تمہارے اور امی کے پاس آنا چاہا لیکن دقت کی گرد نے راستوں کو دھندلا دیا تھا۔ پھر بھی اپنے طور پر بہت کوشش کی کسی طرح تم تک پہنچ جاؤں لیکن کامیابی نہیں ہوئی..... اور آج جب اس دروازے سے نکل کر بھاگا تھا۔ تم نے غور نہیں کیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کہا تھا۔

”میں اندر نہیں جاؤں گا وہ میرا گھلا دبا دیں گے۔“ یعنی میرے لاشعور میں اب بھی یہ

خوف موجود تھا۔" وہ اس کے ہاتھ کو آہستہ تھپکنے لگی جیسے اسے اس خوف سے نکال رہی ہو۔ پھر کہنے لگی۔

"ہم ہے فراز.....! میں نے تم سے ملنے کی بہت دعائیں مانگی تھیں۔ کبھی کبھی مایوس بھی ہوئی لیکن پھر امید کا دامن تمام لیا..... اور اب مجھے لگ رہا ہے جیسے میں ایک دم بہت مضبوط ہو گئی ہوں، اور وقت کا ظالم پنجہ جو ہمیشہ میری تاک میں رہا۔ میری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو دبوچنے میں اس نے کبھی دیر نہیں کی لیکن اب۔"

"میں اسے تمہاری طرف بڑھنے نہیں دوں گا۔"

"ہاں فراز.....! ہم مل کر اسے مات دیں گے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "اگر سوچو فراز تو اس گھر میں کبھی کوئی خوشی نہیں اتری۔ یہ نہیں کہ ہم نے نہیں دیکھی بلکہ کبھی خوشی آئی ہی نہیں۔ امی سے پہلے دادی بھی حالات کا شکار رہیں، پھر امی اور ان کے بعد غیر جانبداری سے سوچو تو اماں (زرین بیگم) بھی حالات کی چکی میں پستی رہی ہیں۔"

"اور یہ سب ابا کی وجہ سے ہوا۔" اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے وہ بول پڑا۔ "تم ہر امت ماننا راجہ! میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ گھر کا دار و مدار گھر کے سربراہ پر ہوتا ہے۔ اور اگر سربراہ ہی ٹھیک نہ ہو تو گھر کا شیرازہ یوں ٹکھرتا ہے خوشیاں رامت بھول جاتی ہیں اور دکھ ہر پل دستک دیتے چلے آتے ہیں۔ ہم لاکھ امید کا دامن تھا میں، یا لاکھ آس کے دیے روشن رکھیں، انتظار فصل گل طویل سے طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے انسان وہی کاٹتا ہے جو بویا گیا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سربراہ تو دکھوں کے بیج بوئے اور ہم فصل گل کاٹنے کی بات کریں اور یہی بات راجہ تم اپنی بے جی کو بھی سمجھا دینا۔"

"انہوں نے اگر اپنے غلط نظریات، ضد اور ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو ان کے گھر کا بھی اللہ حافظ ہے۔ آج نالکہ بھائی ان سے خفا ہیں، کل ایک ایک کر کے سب الگ ہو جائیں گے تب ان کی سمجھ میں آئے گا۔"

"اللہ نہ کرے فراز، جو اس گھر کو کسی کی نظر لگے۔" وہ غلوص دل سے بولی۔

"جسمیں کیا دیا ہے اس گھر نے جو دل میں ان کا درور رکھتی ہو.....؟"

"بہت کچھ....." وہ بولی۔ "اتنا تو ساری زندگی نہیں ملا، جتنا ایک برس میں حسام نے دیا اور اسی کے تاتے مجھے وہ گھر اور اس کے مکین بہت عزیز ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر پوچھنے لگا۔

"حسام کیسا تھا.....؟"

"دیکھتا تھا..... میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس کی تعریف کے لیے اور تم اس کی اچھائی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"میرا خیال ہے، میں اندازہ کر سکتا ہوں۔"

"کیسے.....؟"

"نالکہ بھائی کو دیکھ کر۔"

"ہاں.....! وہ بہت حد تک اپنے بھائی سے ملتی ہے۔ نہ صرف شکلا بلکہ عادات بھی۔"

"اور سہجہ.....؟"

"صہجہ بھی بہت اچھی ہے۔" پھر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "تم کب سے جانتے ہو سہجہ کو.....؟" وہ ہنس پڑا۔

"ہاؤ ناں....."

"پہلے نالکہ بھائی کی شادی میں دیکھا تھا۔ پھر یونیورسٹی میں دیکھنے میں اچھی لگتی تھی پھر جب معلوم ہوا کہ نالکہ بھائی کی بہن ہے تو سوچا۔ یقیناً عادت کی بھی اچھی ہوگی۔ پہلے راہ و رسم بڑھائی پھر شادی کی بات کی۔ وہ بھی یہی چاہتی ہے لیکن بے جی۔"

"ہو سکتا ہے، اب بے جی انکار نہ کریں۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اماں آگئیں۔ کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ کہنے لگی۔

"معاف کیجیے اماں.....! میں آج بالکل آپ کا ہاتھ نہ بنا سکی۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا.....! چلو اب جلدی سے آ جاؤ۔" وہ فراز کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی

پھر کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ ابا بھی پہلی بار دسترخوان پر سب کے ساتھ شریک تھے۔ زیادہ باتیں تو نہیں کیں بس فراز سے اتنا پوچھا۔

"اب تو تم یہیں رہو گے ناں....." اس نے انکار تو نہیں کیا سہولت سے یہ بات سمجھا دی کہ

جن لوگوں نے ایک عمر اپنی اولاد سمجھ کر پرورش کی ہے۔ انہیں یوں چھوڑ دینا انسانیت نہیں ہے۔

راجہ بھی اس کی بات سے متفق تھی۔ ویسے اس نے یقین دلایا کہ اب وہ اس گھر سے غافل نہیں رہے گا اور اسے غافل رہنا بھی نہیں چاہئے تھا، نہ صرف ابا بلکہ اس پورے گھر کو اس کی ضرورت تھی۔

کھانے کے بعد وہ علی کو سلانے کے لیے لیتی تو اسے بھی نیند آ گئی۔ وہ اس وقت نہیں

سوتی تھی اگر آنکھ لگ بھی جاتی تو کچھ دیر میں اٹھ بھی جاتی تھی لیکن آج ایک مدت بعد وہ گہری

اور پرسکون نیند سوئی کہ شام میں اماں کے اٹھانے پر ہی اٹھی تھی۔ اپنے آپ پر حیران ہوتی

ہوئی کمرے سے نکلی تو سب بہن بھائیوں کو آنگن میں بیٹھے دیکھا۔ فراز سب کے ساتھ یوں بیٹھا تھا جیسے شروع سے ہی ان کے ساتھ رہا ہو۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور منہ ہاتھ دھر کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ شبو چائے لے آئی تھی۔ پھر چائے پینے کے بعد ہی وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ علی کا منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے تبدیل کر رہی تھی کہ فراز اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔

”رابعہ.....! میرا خیال ہے۔ اب تم وہاں مت رہو۔“

”کیا.....؟“ وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”دیکھو ناں.....! ایک طرح سے انہوں نے تمہیں اپنے سے خارج ہی کر دیا ہے تو پھر۔“
”نہیں فراز.....! ایسا نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ ”اس گھر کا کوئی بھی فرد میری ذات سے غافل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بے جی بھی اور پھر میں نے خود وہاں رہنا منظور کیا تھا۔“

قدرے توقف کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”وہی میرا گھر ہے اور میں خود سے اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

اس کا دل چاہا کہے گویا انتظار میں ہو کہ وہ خود تمہیں نکالیں۔ لیکن خاموش رہا۔ وہ اسے آزر دہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”کیسے جاؤ گی.....؟“

”بے جی گاڑی بھجوائیں گی۔“ اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ ”دیکھا۔ وہ مجھ سے غافل نہیں

ہیں۔“ وہ ہنسا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جہاں رہو خوش رہو۔“

○○○

اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ کسی اونچی سی جگہ پر کمزری ہو کر چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اکٹھا کر لے اور انہیں فراز کے بارے میں بتائے۔

”میرا بھائی، میرا مان جو برسوں پہلے انتظار کی سولی پر لٹکا گیا تھا۔ اب آ گیا ہے۔“

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ جب گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے بے جی سے سامنا ہوا۔ وہ انہی سے کہنے لگی۔

”بے جی.....! آپ کو یاد ہے میرا ایک بھائی بھی تھا جو بچپن ہی میں کہیں چلا گیا تھا۔“

”فراز.....!“ بے جی نے اس کا نام لیا تو وہ فوراً کہنے لگی۔

”ہاں بے جی.....! فراز..... وہ آ گیا ہے۔ وہی فراز بے جی جو عاطف کا کزن ہے۔“

○○○

اندرونی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر اتر آیا تھا اور آنکھیں دکنے لگی تھیں۔ ایک مدت کے بعد بے جی نے اسے یوں خوش ہوتے دیکھا تھا۔ فوری طور پر مامتا کا جذبہ غالب آیا اور بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”مبارک ہو.....“ انہوں نے کہا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”کاش! بے جی.....! آج امی زندہ ہوتیں تو اسے دیکھ کر کتنی خوش ہوتیں۔“

بے جی نے اس کا سراپے کندھے سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگیں۔ اسی وقت فخر حیات آ گئے۔ ان کے لیے یہ منظر واقعی حیران کن تھا۔ آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ بے جی کی نظر ان پر پڑی۔ فوراً راجہ کو الگ کر کے اسے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ پہلے تو وہ کبھی نہیں لیکن جب اس نے بھی بابا کو دیکھا تو علی کو اٹھا کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی برآمدہ پار کر گئی۔ پھر جس نے بھی سنا، خوشی کا اظہار کیا۔ اور وہ تو تھی ہی بہت خوش۔

فراز اکثر شام میں آ جاتا اور کافی وقت علی اور اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ صبح یونیورسٹی، دوپہر میں ابا کے پاس چلا جاتا اور انہی کے ساتھ اس گھر کی ذمہ داریاں کو محسوس کرتے ہوئے بخوبی سمجھنا بھی چاہتا تھا۔ شام میں کسی وقت رابعہ کے پاس آ جاتا ورنہ وہی گھر جہاں وہ پروان چڑھتا تھا۔

اس دن وہ علی کے ساتھ خاصی اوٹ پٹائی حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ فائینگ کرتا اور کبھی اس کے چاروں ہاتھ پیر پکڑ کر زور زور سے جھلانے لگتا۔ علی اسی میں خوش تھا اور مسلسل کھٹکھٹا کر فیس رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک دلچسپی سے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

”بس کرو..... زیادہ تھک جائے گا تو پھر رات کو نیند میں بھی روئے گا۔“

”میں کیا کروں یہ خود ہی نہیں مان رہا۔“ اس نے علی کو فوم پر اچھالا تو وہ پھر کھڑا ہو گیا۔

”ذرا سا ڈانٹ دو۔“

”نہیں بھئی..... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”علی.....!“ اس نے خود ہی علی کو آنکھیں دکھائیں تو وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ پھر وہ

اس سے کہنے لگی۔

”میں کتنی دیر سے تم سے بات کرنا چاہ رہی ہوں۔“

”ہاں کہو.....!“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مجھے یہ بتاؤ.....! تمہارے رشتے کی بات کہاں تک پہنچی۔ میرا مطلب ہے رشتہ الکل دوبارہ بے جی کے پاس آئے یا نہیں.....؟“

”نہیں..... ابھی میں نے خود انہیں روک دیا ہے۔“

”کیوں.....؟“

”ابھی میں شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں رابعہ.....!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پہلے میں اکیلا تھا لیکن اب کچھ ذمہ داریاں میری جھولی میں آن گری ہیں۔ ابا کا علاج، شیواور شوکی شادی اور میں چاہتا ہوں مکمل اور ناصبر کو بھی کوئی ڈھنگ کا کاروبار کروادوں میرا مطلب ہے کوئی جنرل اسٹور وغیرہ..... اور پھر تم ہو، تمہیں اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتا۔ جب تک ان سب مسئلوں کو حل نہ کر لوں اپنے بارے میں سوچ سکتا۔“

”فرار.....! تم نے تو میرا مان بڑھا دیا ہے میرے بھائی تم واقعی بڑے آدمی ہو۔“

”تم ضرور کامیاب ہو گے۔“ وہ یقین سے بولی۔ ”امی کا خواب ضرور پورا ہوگا۔“

”ہاں.....! اور تم گواہ رہنا رابعہ.....! کہ اس مقام پر میں امی، اپنے اور تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لے سکتا تھا لیکن طاقت رکھتے ہوئے بھی میں ایسا نہیں کر رہا اور میں اپنی اس نیکی کو اپنی امی مہر النساء سے منسوب کرتا ہوں۔“ اس کی آواز کا بوجھل پن رابعہ کی آنکھوں کی سطح گیلی کر گیا۔

”سنو.....!“ وہ اس کا ہاتھ تھپک کر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”انکل رحمن اور انٹی تم سے ملنا چاہتے ہیں اور کئی بار نائلہ بھائی کہہ چکی ہیں کہ میں تمہیں لے کر آؤں۔“

”بے جی سے اجازت لے کر کسی دن چلوں گی۔“

”کسی دن کیوں.....؟ کل ہی چلو۔ کل میں یونیورسٹی سے سیدھا یہاں آ جاؤں گا پھر میرے ساتھ چلنا۔“

”کل نہیں جاسکوں گی۔“

”کیوں.....؟“

”اصل میں کل احتشام بھائی کے بیٹے رضا کی برتھ ڈے ہے۔“

”تمہیں کون سا بے جی اس تقریب میں شریک ہونے دیں گی۔ ان کی نظروں میں تو تم.....!“

”پھر بھی.....“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میری یہاں موجودگی ضروری ہے۔“

”اچھا..... تو پھر جیسے تمہیں سہولت ہو، مجھے بتا دینا۔“ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

○ ○ ○

رضا کی سالگرہ کی تیاریاں کئی دنوں سے ہو رہی تھیں، اور آج تو پورا گھر بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ شام ہی رنگ برنگے قہقہے چلنے لگے تھے۔ نائلہ ابھی تک بے جی سے خفا تھی اور ان ہی کی وجہ سے آنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن احتشام بھائی اور صائمہ بھابی دوپہر ہی میں چلی گئی اور بے جی وہاں کسی سے آئیں تو وہ اٹھ کر ان کے سامنے ہی کمرے سے نکل گئی۔ بے جی دل مسوس کر رہ گئیں، خاموش اس لیے تھیں کہ کہیں خوشی کے موقع پر کوئی بد مزگی نہ پیدا ہو۔ شام میں جب مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تب وہ چپ چاپ رابعہ کے پاس چلی آئی۔

”سب لوگ تمہاری غیر موجودگی کو محسوس کریں گے۔“ اسے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر رابعہ کہنے لگی۔

”کرنے دیں..... وہاں میری طبیعت گھبرانے لگی تھی۔“

”چائے پیو گی.....؟“

”ہاں.....! اگر بنانے میں زحمت نہ ہو بلکہ تم بیٹھو، میں بنالاتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی تو رابعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

”میں ویسے بھی ابھی چائے بنانے ہی جا رہی تھی۔“ اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ چائے لے کر آئی تو اس نے دیکھا۔ نائلہ ہاتھوں میں ایک تصویر لیے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ حسام کی تصویر ہے جسے ابھی کچھ دیر پہلے وہ خود نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی اور نائلہ کے آنے پر اس نے تصویر یونہی عکس پر رکھ چھوڑی تھی۔

”چائے لو۔“ اس نے متوجہ کیا تو نائلہ نے پہلے تصویر عکس پر رکھی پھر اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔

”علی کہاں ہے.....؟“ چائے کا سپ لیے ہوئے نائلہ پوچھنے لگی۔

”ابھی کچھ دیر پہلے انعام اسے لے کر گیا ہے۔“

”اچھا.....!“ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگیں۔

”رابعہ.....!“ پھر نائلہ نے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سنو.....! ہمیں اب اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ حسام ہمارے درمیان نہیں رہا۔“
 ”کیا کہنا چاہتی ہو تم.....!“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔
 ”یہی کہ اس کی تصویروں سے اپنے آپ کو بہلانا چھوڑ دو۔“

”میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نالکہ کہ میں اس کی تصویروں کو دیکھوں یا نہ دیکھوں۔ اس کا خیال ہی اتنا زور آور ہے کہ میری ہر سانس مہکتی ہے اور شاید تم یقین نہ کرو، میں اسے اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔“
 ”یہ سراسر خود فریبی ہے رابعہ.....!“

”اگر یہ خود فریبی ہے تو مجھے اس میں مبتلا رہنے دو۔ اس سے نکل کر میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔“

”زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ آگے زندگی بہت طویل ہے جو کسی سہارے کے بغیر.....“
 ”حسام نے مجھے بے سہارا و بے آسرا نہیں چھوڑا نالکہ.....!“ وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔ ”علی ہے میرے ساتھ۔“

نالکہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔
 ”سنو.....! اگر میں خود غرضی سے سوچوں تو مجھے تمہاری بات سے خوشی ہوگی کہ چلو تم ساری زندگی میرے بھائی کے نام پر بیٹھ کر اس کے بچے کو پالو گی۔ قصہ ہی ختم۔ لیکن میں خود غرض نہیں ہوں رابعہ.....! میرے سامنے تمہاری پہاڑی زندگی ہے۔“

”کسی نہ کسی طور کٹ ہی جائے گی۔“ وہ یوں بولی جیسے یہ موضوع ختم کر دینا چاہتی ہو۔
 ”ہاں.....! کٹ تو ہر حال میں جاتی ہے۔“ نالکہ نے سینے میں دبی سانس ایک آہ کی صورت خارج کی۔

”لیکن زندگی کا ہم پر اتنا حق ضرور ہے کہ ہم اسے بہتر طور پر گزارنے کی کوشش کریں۔ خود ہی سوچو، اگر ہر شخص یہ سوچ کر بیٹھ جائے کہ کٹ تو جانی ہے تو جدوجہد کا مقصد کہاں باقی رہ جاتا ہے.....؟“

”میں نے کہاں ناں..... علی جو ہے..... میری جدوجہد اسی کے لیے ہوگی۔“
 ”اس کوٹھری میں مقید ہو کر اس کے لیے کیا جدوجہد کر سکو گی تم.....؟“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”میں اس گھر میں ہوتی نہیں، کل کو صبح بھی چلی جائے گی، احتشام بھائی اپنے بال بچوں میں مصروف اور ایسی ہی مصروفیت انعام کو بھی مل جائے گی۔ باقی رہ جاتے ہیں بابا اور بے جی تو ان

سے تم کیا توقع رکھتی ہو۔“ اس کے خاموشی سے دیکھتے رہنے پر کہنے لگی۔
 ”ابھی انہوں نے تمہیں گھر سے نکال کر اس کوٹھری میں ڈال دیا ہے کل کو یہاں سے نکالیں گے تو۔“

”پلیز نالکہ.....! بس کرو۔“ وہ رونے لگی۔ ”فراز بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے جبکہ میں نے تو سب کشتیاں اپنے ہاتھوں سے جلا ڈالی ہیں۔“

”فراز ٹھیک کہتا ہے اور میں بھی کہہ رہی ہوں کہ اپنے بارے میں سوچو۔“
 ”مجھے اپنے بارے میں نہیں سوچنا۔“ وہ اور شدت سے روتے ہوئی بولی۔
 ”کوئی ایسا راستہ بتاؤ جس پر میں علی کی انگلی تھام کر چل سکوں۔“

”ابھی علی کو خود تمہاری انگلی تھامنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ۔“ اس کی تیز ہوتی سسکیوں میں نالکہ کی آواز دب گئی۔
 ”تم نے شاید میری بات نہیں سنی۔“ نالکہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں اور چائے بنا کر لاتی ہوں اور سنو.....! جب میں واپس آؤں تو تمہیں روتے نہ دیکھوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔
 ”اوں ہوں.....! رونا مت۔“ وہ جو کہیں آس پاس محسوس ہوتا تھا اس کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

”اب ذرا بس کر دکھا دو تا کہ میں سمجھوں تم یہ کام بخوبی کر سکتی ہو۔“
 اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کیں اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آوازوں کی بازگشت سننے لگی۔ ان آوازوں میں گھر کا اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ نالکہ چائے لے کر آئی تو اسے پتا ہی نہیں چلا۔

”رابعہ.....!“ اس کے پکارنے پر وہ چونکی اور خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا سوچنے لگی تھیں.....؟“
 ”تم نے میں حسام کی سرگوشیاں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔
 ”یہ سب تمہارا وہم ہے اور ان واہموں میں مت گھرو۔ لو چائے پیو۔“ ہم اس کے ہاتھ

میں تھما کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”تمہیں یہ سب اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو تھما کر لیا ہے۔ اس کے خیال کو اپنے آپ پر اتنا طاری مت کرو کہ زندہ لاش بن کر رہ جاؤ۔ ہاں نکلو۔ اپنے لیے دوسری دلچسپیاں

ملاش کرو۔ مصروف رہو گی تو اس کی یاد میں اتنی شدت نہیں رہے گی۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”تم بے جی سے ڈرتی ہو ناں تو انہیں ہم کسی نہ کسی طرح سمجھا ہی لیں گے۔ بس تم اپنے دل میں مغلجائش پیدا کرو۔ بہت لوگ ہیں جو تمہاری طرف.....“

”اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی..... دروازہ بڑی زور سے کھلا تھا..... ساتھ ہی فطرت جات کی اونیٹی پکار۔

”رابعہ.....!“ دوسری بار پکارتے ہوئے وہ اندر چلے آئے تو وہ دونوں فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

”آپ یہاں کیسے آئے.....؟“ نائلہ پوچھنے لگی۔ کوشش کے باوجود وہ لہجے میں چھپے طرکوں چھپاسکی۔

”اور تم یہاں کیا کر رہی ہو.....؟“ وہ اس سے پوچھنے لگے۔

”میں رابعہ کے پاس آیا ہوں۔“ وہ اسی کے لہجے میں بولے۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ شیشائی اور رابعہ کی طرف دیکھنے لگی جو قدرے خوفزدہ ہو کر باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”اصل قصہ یوں ہے بیٹا کہ.....“ وہ آرام سے ریڈ پر بیٹھے، دونوں کے ہاتھ پکڑ کر دائیں بائیں بٹھایا۔ پھر تفصیل بتانے لگے کہ کس طرح انہوں نے بے جی کو آذایا پھر رابعہ کے حق میں ان کی طرفداری حاصل کرنے کے لیے نائلہ رچایا اور آخر میں اپنے جال میں خودی پھنس گئے۔ وہ دونوں حیرت سے سن رہی تھیں۔

”رابعہ.....! تم مجھے معاف کر دو بیٹا.....!“ وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”میں بھی ان دونوں ایک ٹل کے لیے جمن سے نہیں رہا۔“ وہ ان کی محبت پر رونے لگی۔

”ایک تو تم رونے بہت جلد لگ جاتی ہو۔“ نائلہ نے اسے ٹوکا پھر بابا سے پوچھنے لگی۔

”اب آپ کے کیا ارادے ہیں۔“

”ارادے بڑے نیک ہیں۔“ تم دونوں میرے ساتھ چلو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”کہاں.....؟“ نائلہ ساری باتیں سیکھ جان لیٹا چاہتی تھی۔

”اپنی بے جی کے پاس۔“

”کیا انہیں معلوم ہے کہ آپ رابعہ کو لے کر آ رہے ہیں۔“

”نہیں..... میں ان کو بتا کر نہیں آیا۔“

”ایسا نہ ہو بابا کہ.....“

”جو ہوگا دیکھا جائے گا..... چلو۔“

وہ مسکرائے اور دونوں کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ اس سے قدم نہیں اٹھائے جارہے تھے، نائلہ کا سہارا لیے جیسے اپنے وجود کو گھسیٹتی جا رہی تھی۔ خوفزدہ بھی بہت تھی۔

”چائیں اب کیا ہوگا۔“ دل اندیشوں میں گمراہی سوچے جا رہا تھا۔

”ڈرتا مت۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ انہوں نے رابعہ کو حوصلہ دیا اور پھر بے جی کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔

”صالحہ بیگم..... ایہ دونوں لڑکیاں اس خوشیوں بھری محفل سے دور اپنی الگ دنیا بسائے بیٹھی تھیں۔“ بے جی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”نائلہ سے کس نے کہا کہ وہ یہ خوشیوں بھرا ہنگامہ چھوڑ کر جا بیٹھے۔“ بے جی اپنی حیرت چھپاتے ہوئے بولیں۔

”نائلہ کا نام لیا آپ نے..... رابعہ کا نہیں۔“

”رابعہ کا ان خوشیوں پر کوئی حق نہیں۔“

”کیوں.....؟“

”اس کے تعصب میں جتنی خوشیاں لکھی گئی تھیں وہ اس نے حاصل کر لیں۔“

ابھی تو بہت زندگی پڑی ہے اور بہت خوشیاں دیکھنی ہیں اس نے۔ کیوں رابعہ.....“

غضب ہوا جو انہوں نے اسے مخاطب کر لیا۔ رہا سہا حوصلہ بھی جا چکا رہا۔ نائلہ سہارا نہ دیے ہوئی تو بیچتا دھڑاسے فرش پر جا گرتی۔

”کیا ہوا بیٹا.....!“ اس کے زور پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بابا پریشانی سے پوچھنے لگے۔ وہ بولنے کے قابل کیاں تھی، کھڑکی کے کچے کا ہتھی رہی۔

”آپ اسے یہاں کیوں لائے ہیں.....؟“ بے جی کا غصہ ظاہر ہونے لگا جبکہ وہ سوچ پکے تھے کہ آخری حد تک آرام سے بات کریں گے۔

”کیا اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا.....؟“

”نہیں۔“

”کیوں.....؟“

”میں نہیں چاہتی کہ اس گھر کی خوشیوں پر اس کی غوسہ کا ہلکا سا سایہ بھی پڑے۔“ اس کے

ساتھ ہی انہوں نے رخ موڑ لیا۔

”صالح بیگم ایک بار جب میں نے اسے منہ سے کہا تھا تو آپ نے مجھے ٹوکا تھا کہ اس کی دل آزاری ہوگی۔ اب آپ کو اس کی دل آزاری کا خیال نہیں آیا۔؟“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ بس اب اسے یہاں سے لے جائیں۔“

”یہ نہیں جائے گی۔“

”کیوں۔۔۔۔؟“

”اس لیے کہ میں خود اسے لے کر آیا ہوں۔“

”اور آپ ہی نے اسے یہاں سے نکالا بھی تھا۔“ بے جی نے جتنا چاہا۔

”ہاں۔۔۔۔! لیکن محض آپ کا رد عمل دیکھنے کے لیے۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا آپ مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گی لیکن آپ تو جیسے تیار بیٹھی تھیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ بے جی نے فوراً پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

”مجھے آپ کے عمل نے دکھ پہنچایا تھا۔“ وہ کہنے لگے۔ اور اگر میں چاہتا تو اسی وقت رابعہ کو لے آتا لیکن میں خاموش رہا کیونکہ آپ سے الجھتا نہیں چاہتا تھا۔“

”قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔“

”خدا گواہ ہے جس دن سے رابعہ وہاں منتقل ہوئی ہے، میں ایک ہل سکون سے نہیں رہ سکا کیونکہ میں اپنے اس عمل کی بدولت خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گا۔ اور نہ صرف خدا کے سامنے بلکہ حسام کے سامنے بھی۔ ذرا بتائیے تو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ حسام کو کہ اس کے بعد ہم نے اس کی بیوی اور بچے کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔“

بے جی کی نظریں رابعہ پر جا ٹھہریں جو سر جھکائے کھڑی تھی۔

”جب آپ نے اپنا مذہب چھوڑا تو اس سے وابستہ ہر بات آپ کو بھلا دینی چاہیے تھی ورنہ مجھے کہنا پڑے گا کہ آپ نے مجھے اور میرے مذہب کو خلوص نیت سے نہیں اپنایا۔ خود بھی دھوکے میں رہیں اور ہمیں بھی دھوکا دیا۔“

”خضر۔۔۔۔! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔۔!“ بے جی کو دکھ کیسے نہ ہوتا کہ ایک عمر کی ریاضت خاک میں ملائے دے رہے تھے۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا۔“ ان کا لہجہ اب بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ ”ہمارا مذہب بہت وسیع ہے۔ ہر ایک کے لیے اس میں گنجائش ہے۔“

”میں اس سے انکار نہیں کرتی۔“

”انکار نہیں کرتی تو جس خدا پر ایمان لائی ہیں۔ اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس بچی کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیجیے کہ یہ بیوہ ہے تو منہ سے ہوگی۔ ہمارے ہاں نرسٹ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ سب زمانہ جاہلیت کی باتیں ہیں۔ یقین رکھیں کہ ہر بات اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں۔“

”قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔“

”حسام اگر اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا تو اس میں رابعہ کا کیا قصور۔ جو اسے اتنی بڑی سزا دے ڈالی۔ ہمارا فرض تھا، اس کی دلجوئی کرنا نہ کہ ایک کونے میں ڈال دینا۔“

”بے جی نے سر جھکا لیا۔“

”بے جی۔۔۔۔! اگر دل میں نیکی کا ذرا سا بھی خیال آئے تو اس پر فوراً عمل کر لیتا چاہیے۔“

”نند نے لب کشائی کی پھر رابعہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگی۔“

”جاؤ رابعہ۔۔۔۔! تم پہلے بڑھ کر بے جی کو معذور کرو۔“

”آپ میری ماں ہیں بے جی۔“ اس کے صلق سے بمشکل آواز نکلی پھر وہ بڑھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”ارے۔۔۔۔!“ بے جی دو قدم پیچھے ہٹیں پھر اس کے ساتھ ہی فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے۔

”اگلے ہل وہ ان کے بازوؤں میں تھی۔ خضر حیات نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے قریب کھڑی

ناند کی طرف دیکھا تو وہ ان کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

”بابا۔۔۔! یہی وقت ہے کوئی اور بات منوانی ہو تو وہ بھی منوالیجیے۔“

”مثلاً۔۔۔۔؟“ وہ بھی سرگوشی میں بولے۔

”رابعہ کے مستقبل کے بارے میں۔“

انہوں نے اس کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا پھر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے، بے جی اپنے دوپٹے کے پوے آئیں خشک کر دی تھیں جب کہ وہ یہ کام اپنی اٹھیلیوں سے کر رہی تھی۔ اسی وقت انعام، علی کو لیے ہوئے اندر آیا، رابعہ پر نظر پڑی تو پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”میرے خدا۔۔۔۔! بھائی آپ یہاں ہیں۔ ہم بچا، بھتیجا پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اور اب تو میں علی کو یہاں چھوڑ کر مسجد میں اعلان کروانے جا رہا

تھا۔“

پھر سب کو اپنی جگہ خاموش کھڑے دیکھ کر وہ صورت حال دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”کیا ہوا.....؟“ کچھ نہ سمجھا تو پوچھنے لگا۔

”بھئی.....! یہاں ایک گھنٹے کے اندر بڑی زبردست قسم کی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں۔“

”بے جی اس خوشی کے موقع پر رابعہ کو یہاں لے آئی ہیں اور اب یہ یہیں رہے گی۔“ یہاں نائلہ نے خود بے جی کو معتر کر دیا۔

”ارے واہ.....!“ انعام نے خوشی کا اظہار یوں کیا کہ علی کو ہاتھوں میں لے کر ادھماچھال دیا۔

”کیا کرتے ہو، گر جائے گا۔“ بے جی نے لپک کر علی کو اس سے لے لیا اور بازوؤں میں بھینچ کر پیار کرنے لگیں۔

”صالحہ بیگم.....! اگر اجازت ہو تو اس مبارک موقع پر میں بھی کچھ عرض کروں۔“

”غضر حیات یوں بولے جیسے اس سارے واقعے سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ بے جی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگے۔

”میں رابعہ اور انعام کے بارے میں۔“

ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رابعہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ سب پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا بیٹا.....!“ بے جی نے علی کو بیڈ پر بٹھایا اور اسے کندھوں سے تھام کر پوچھنے لگیں۔

”بے جی.....! میرے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ مت کیجئے۔ انعام کو ہمیشہ میں نے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا ہے۔“

”سمجھا ہے سے کیا مطلب؟ میں ہوں ہی آپ کا بھائی۔ لیکن پلیز آپ اس طرح نہ روئیں۔“

وہ چپ نہیں ہوئی اور نائلہ اپنی جگہ پریشان ہوئی کہ بابا نے انعام کا نام کیوں لیا جب کہ وہ تو کچھ اور ہی سوچ کھڑی تھی۔ بہر حال اس نے اس وقت اپنی سوچ کو زبان نہیں دی۔ موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے سب مہمان آچکے ہوں گے۔ اب ہمیں بھی باہر نکلتا چاہئے، کیوں بے جی.....! رابعہ کو تیار کر دوں.....؟“

بے جی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ رابعہ کو لے کر اس کے اس پہلے والے کمرے میں آگئی۔ پھر رابعہ احتجاج ہی کرتی رہ گئی لیکن اس نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اپنی مرضی سے اس کے لیے

کپڑوں کا انتخاب کیا۔ ہلکے میک اپ کے بعد کانوں میں ٹائپس اور گلے میں لاکٹ ڈالا۔ پھر اس کے دراز بالوں کو صرف اوپر سے کھپ میں قید کر کے پیچھے کھلا چھوڑ دیا۔

”نائلہ.....!“ وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھلے دو سالوں سے اس نے ہر چیز اپنے آپ پر حرام کر رکھی تھی۔ اب اپنا ہی روپ اجنبی لگ رہا تھا۔

”میں اس طرح مہمانوں کے سامنے جاؤں گی.....؟“

”بالکل.....!“ نائلہ نے آخری بار اس کے بالوں میں برش کیا۔ پھر اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھماتے ہوئے بولی۔ ”اور خدا کے لیے رابعہ اپنی شکل ٹھیک کرو۔ ذرا سا مسکراؤ، ورنہ مہمان سمجھیں گے تم انہیں دیکھ کر بیزاری کا اظہار کر رہی ہو۔“

”نہیں تو.....!“ اس کے کہنے پر نائلہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”چلو.....! اب سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ کچھ جھجکتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل آئی۔ برآمدے سے اتر کر لان میں داخل ہونے سے پہلے نائلہ اس سے کہنے لگی۔

”اب پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ لوگ سمجھیں گے۔ میں زبردستی تمہیں گھسیٹ کر لا رہی ہوں۔“

”بس اب اپنی ہدایات بند کرو۔“ اس نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا سب لوگ اسے اپنی طرف دیکھنے لگے۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔

”بکومت.....!“ نائلہ نے خود ہی اس کا ہاتھ تھاما اور کھینچتی ہوئی سب کے درمیان لے آئی۔

”رابعہ ہاؤ سویت.....!“ ”صائمہ بھابی کی حیرت اور اشتیاق میں ڈوبی آواز۔

”ارے بھابی.....!“

صیبہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”رابعہ.....!“ احتشام بھابی نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم میرے لیے کسی طرح بھی نائلہ اور صیبہ سے کم نہیں ہو۔“

یہ اتنی ڈھیر ساری محبتیں، یہ شہد آگئیں لہجے اور تحفظ کا احساس دلاتے اس کے کندھے پر رکے ہاتھ۔ دل ڈرائیں، نہ ہی خوفزدہ ہوا۔ وقت کے ظالم پنجے نے جو چھیننا تھا، چھین لیا۔ اب وہ اپنے دامن پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دے گی۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی اور اکیلی تو پہلے بھی نہیں تھی۔ بس ذرا غافل ہو گئی تھی۔ شاید ایک عمر جتنی دھوپ میں چلنے کے بعد شجر سایہ دار تلے سنانے کو بیٹھی تو کچھ دیر کو آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور اسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر

”میرا خیال تھا۔ میں آج ہی بیگم حیات سے بات کروں گی۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں آئی.....!“ اور اس کی طرف سے بے فکر رہیں، وہ انکار نہیں کرے گا۔“ اس نے یقین دلایا۔

”صرف ہم نہیں تم بھی ہمارے ساتھ بیگم حیات سے بات کرو گی۔ آخر کو اس کی بہن ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کسی کے پکارنے پر انکل رحمن اور آئی دوسری طرف متوجہ ہوئے تو وہ ایک دم تنہا ہو گئی۔

نانکھ اور صبیحہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئیں۔ باقی سب لوگ اجنبی تھے۔ وہ اندر جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ کن اکھیوں سے دیکھا۔ راستے میں کافی مہمان کھڑے تھے۔ ان کے درمیان سے گزر کر جانا اچھا نہیں لگا اس لیے ان کے ہٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پورے وجود سمیت کسی کی نظروں کی گرفت میں آ گئی ہو۔ زخاروں پر تپش کا احساس ہونے لگا اور ٹپکیں باوجود کوشش کے اٹھائی نہ گئیں۔

”جانے کون ہے.....؟“

”اس نے سوچا اور بالکل غیر محسوس طریقے سے اپنا رخ موڑ کر باڑ میں لگے رنگ برنگے تقوؤں کو دیکھنے لگی۔ جلتے بجتے تقوؤں کا عکس اس کی آنکھوں میں بھی لہرائے لگا تھا۔

”رابعہ.....! یہ واقعی آپ ہیں۔“

”اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ گو کہ شناسائی زیادہ نہیں تھی پھر بھی اس آواز کو پہچان گئی۔ دل کچھ اس انداز سے دھڑکنے لگا تھا کہ فوراً ان کی طرف پلٹ بھی نہ سکی۔

”آپ کی یہاں موجودگی حیران کن ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی کا باعث.....“ اس نے بمشکل اپنے آپ پر قابو پایا اور پلٹ کر بہت خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہی زندگی ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”اپنے ساتھ ہونے والے حادثات کو فراموش کر دینا ہی اچھا ہے۔ ورنہ زندگی کی دشواریاں کبھی کم نہیں ہوتیں۔“

”حادثات فراموش نہ بھی کیے جائیں ڈاکٹر آصف.....! تو بھی وقت کی گرد انہیں دھندلا ضرور دیتی ہے لیکن ان کے جوشان دل پر نقش ہو جاتے ہیں، وہ مٹائے نہیں مٹتے۔“

وہ شاید انہیں باور کرانا چاہتی تھی کہ ان کا جو قدم جہاں ہے، وہیں روک لیں۔ اس سے آگے بڑھنے کی نہ وہ اجازت دے گی اور نہ ہی پندیرائی کرے گی۔

وقت کا عالم بچا سے بے سائبان کر گیا تھا۔ اب وہ غافل نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں۔

”آؤ رابعہ.....! سامنے انکل رحمن کھڑے ہیں۔ میں تمہیں ان سے ملواؤں۔“

نانکھ نے کہا تو احتشام بھائی نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر حوصلہ دیا، وہ مسکرائی اور نانکھ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”انکل.....! یہ رابعہ ہے فراز کی بہن۔“ نانکھ نے کہا تو انکل رحمن کے ساتھ ان کی بیگم بھی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس نے سلام کیا اور پوچھنے لگی۔

”فراز نہیں آیا.....؟“

”ہمارے ساتھ تو نہیں آیا۔ ویسے کہہ رہا تھا فارغ ہو گیا تو آ جاؤں گا۔“

”کس کام میں مصروف ہے.....؟“

”وہ آج شام میں اپنے والد کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے والا تھا۔“

”اچھا.....!“ اس نے سر جھکا لیا تو انکل رحمن اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”بیٹا.....! یہ صحیح ہے کہ ہم نے اسے ہی سب کچھ سمجھ لیا تھا لیکن ہم نے اس بات کے لیے

بھی اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھا کہ وہ کبھی بھی ہم سے جدا ہو سکتا ہے۔“

”نہیں انکل.....!“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”وہ آپ سے جدا نہیں ہوگا اور آئی۔ وہ آپ کا بیٹا

ہے۔ ہم کبھی اسے آپ سے الگ کرنے کا نہیں سوچیں گے۔“ آئی جو خاصی ملول نظر آ رہی تھیں، اس کی بات پر کھل اٹھیں۔

”جیتتی رہو بیٹا.....!“ آئی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر کہنے

لگیں۔ ”میں اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں، پہلے تو وہ تیار تھا لیکن اب پتا نہیں کیوں منع کر رہا ہے۔“

”شادی وہ ضرور کرے گا لیکن اس کا کہنا ہے، پہلے وہ اپنی ذمہ داریاں نبھالے، اس کے بعد۔“

”یہ تو اچھی بات ہے کہ وہ ایسا سوچ رہا ہے۔“ انکل کہنے لگے۔ ”لیکن بیٹا ہر ماں کی طرح

تمہاری آئی بھی اب اس کے سر پر سہرا سجانے کی آرزو مند ہیں۔ اور پھر بیگم حیات اس کے انتظار میں اپنی بیٹی کو بٹھائے نہیں رکھیں گی۔“ وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم اسے شادی کے لیے آمادہ کرو، ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اسے اس کے فرائض سے غافل

نہیں ہونے دیں گے۔ تم ہماری بات سمجھ رہی ہوتا.....؟“

”جی.....!“

”میں آپ کے دل پر نقش کسی بھی حادثے یا محبتوں کے نشان مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ ہاں البتہ ہاتھ تھامنے کی جسارت ضرور کروں گا۔“

”میرے خدا.....!“ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دو قدم پیچھے ہٹی۔ راستے پر نظر ڈالی۔ وہاں اب بھی مہمان کھڑے تھے۔ لیکن وہ رکی نہیں سب کے درمیان میں سے راستہ بناتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔ ڈاکٹر آصف جہانگیر نے وہیں کھڑے رہ کر اسے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے دلچسپی سے دیکھا۔

اس کے بند دروازے پر دستک دینے کا فیصلہ تو انہوں نے اول روز ہی کر لیا تھا اور اب سوچ رہے تھے، دستک دینے میں محض وقت کا زیاں ہے انہیں براہ راست اندر داخل ہو جانا چاہیے۔

پھر کیک کاٹنے کی رسم ہال کمرے میں ادا کی گئی۔ اس کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ نائکہ، صبیحہ اور صائمہ بھابی کے ساتھ وہ بھی میز بانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ کافی مہمان کھانا کھاتے ہی رخصت ہونے لگے تھے۔ وہ کسی کام سے باہر آئی تو اس کی نظر فراز پر پڑی جو عاطف کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔

”تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی.....؟“ جواب دینے کے بجائے فراز حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہو.....؟“ وہ شیشائی۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں موجود ہو تو میں سرشام ہی آ جاتا۔“

”مجھے یقین ہونا تھا۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”ہاں.....! تمہارا مقام یہیں ہے۔“ وہ ایک قدم میں دو سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

”یہ تو اب بھی نہیں آ رہا تھا۔“ عاطف کہنے لگا۔

”انکل رحمن نے فون کیا ہے تب آیا ہے۔“

”تم اپنا کوڈ کنٹر کے پاس لے گئے تھے.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”ہاں.....! اور وہاں سے تو میں جلدی فارغ ہو گیا تھا۔“

”پھر یہاں آنے میں دیر کیوں کی۔“ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”خیر چھوڑو..... اصل بات یہ ہے کہ انکل رحمن، آنٹی اور میں تمہارے سلسلے میں بے جی اور بابا سے بات کر رہے ہیں۔“

”لیکن رابعہ.....!“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”لیکن ویکن چھوڑو۔ آنٹی کی یہی خواہش ہے اور تمہیں ان کی خواہش رو نہیں کرنی چاہیے۔“

”میں ان کی خواہش رو نہیں کر رہا لیکن مجھے کچھ وقت چاہیے۔“

”یہی مناسب وقت ہے اور باقی کام بھی اپنے مقررہ وقت پر ہو جائیں گے جب خدا کو

دیکھو ہو گا کیا سمجھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“

”بس سب ٹھیک ہے۔“ وہ اس کے لیکن کہنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ پھر ہنستے ہوئے

عاطف کی طرف دیکھا اس نے بھی تائید کی۔

”گویا یہاں محاذ بن چکا ہے۔“ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

”دو لوں بہن بھائی کے خلاف۔“ عاطف نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب سمجھانے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے آؤ فراز.....!“

وہ فراز کے بازو میں بازو ڈال کر تقریباً کھینچتا ہوا اندر کی طرف چلا گیا اور وہ بس کچھ دیر کوئی

اس کی بات کو سوچ سکی تھی کہ نائکہ کے پکارنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

پھر جب سب مہمان رخصت ہو گئے۔ تب انکل رحمن اور آنٹی نے بے جی کو گھیر لیا۔ انکل

رحمن کے اشارے پر وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ بابا اور احتشام بھائی تو پہلے ہی راضی تھے اور

اعتراض تو بے جی کو بھی نہیں تھا بس یہ بات کہ فراز، رحمن صاحب کا بیٹا نہیں ہے ان کے دل میں

کھٹکتی تھی اور اب تو یہ کھٹک بھی نہیں رہی تھی۔

برسوں پہلے انہوں نے مہر النساء سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے بعد ان کی اولاد کے سر پر

ہاتھ رکھیں گی۔ اور دست شفقت تو انہوں نے اسی وقت بڑھایا تھا جب مہر النساء نے اس دنیا سے

ناتا توڑا تھا۔ لیکن فراز اس سائے سے خود ہی دور چلا گیا۔ اور رابعہ کو زریں بیگم نے ان کے پاس

آنے نہیں دیا تھا اور اب وقت اور حالات نے ایک بار پھر ان دونوں کو ان کے سامنے لا کھڑا کیا

تھا۔ اب وہ روایتوں پر اڑنے والی عورت نہیں رہی تھیں۔ اب صرف ماما کا جذبہ جو گزشتہ دو

سالوں میں رابعہ کو روایتوں کی بجائے چڑھا کر بھی کئی بار ان پر غالب آیا تھا کہ اسے کھانے میں

سب کے ساتھ شریک نہ کر کے بعد میں ہدایت ضرور کر تیں۔

”آرام اور اطمینان سے بیٹھ کر کھاؤ۔“

علی چارپائی سے گر کر کمرے میں ڈبل بیڈ کے ساتھ ساتھ کارپٹ بھی بچھوا دیا۔ یہ ان کی

محبت ہی تھی کہ اس سے غافل ہو کر بھی غافل نہیں رہیں۔ اور اب تو غفلت کے اندھیرے مکمل طور

پر چھٹ چکے تھے۔

”تم شاید دو کشتیوں میں سوار ہو.....؟“ ایک بار خضر حیات نے کہا تھا۔

”نہیں.....“ انہوں نے سختی سے تردید کی تھی۔ ”تمہاری کشتی میں پاؤں رکھنے ہی میں نے اپنی کشتی کو وہیں چھوڑ دیا تھا اور پھر اسے ڈوبتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تم گواہ ہو خضر.....! گواہ رہنا۔“

اور اب صرف خضر حیات گواہ نہیں تھے۔ ان کے ساتھ باقی سب نے بھی دیکھا کہ بے جی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر راجہ اور فرزندوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے لیا تھا۔

”تمہاری رگوں میں اس عظیم عورت کا خون دوڑتا ہے جو خود ایک جوان بیٹے حق نواز کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا تھی۔ اس نے ہمیں سہارا دیا۔ اس وقت جب ہم نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور یہاں ہمارا کوئی نہیں تھا۔ پھر مہر النساء جس کا خیر ایثار اور وفا کی مٹی سے گندھا تھا تم دونوں اس جیسا صبر اور عزم لے کر پیدا ہوئے ہو۔ میری کوتاہیاں میری غلطیاں معاف کر دو، میرے بچہ.....!“

بے جی کی آواز بھرا گئی تو اس نے تڑپ کر ان کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”آپ ہماری ماں ہیں بے جی.....! اور مائیں غلطیاں نہیں کرتی۔ بس اولاد کو عملی زندگی میں ثابت قدمی سکھانے کے لیے انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اور آپ نے ایسا کیا تو کیا برا کیا۔ یہی ہمارے حق میں بہتر تھا۔“

”راجہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ماحول میں جو سنجیدگی اور بوجھل پن اتر آیا تھا۔ اسے دور کرنے کی خاطر خضر حیات نے بڑھ کر راجہ کو بے جی سے الگ کیا پھر اونچی آواز میں نائلہ سے کہنے لگے۔

”نائلہ.....! اب اس گھر میں رشتے ناتے کیا بغیر مٹھائی کے طے ہوا کریں گے.....؟“

”نہیں تو بابا.....!“ وہ فوراً بولی۔

”تو جاؤ.....! مٹھائی کے ساتھ ساتھ اچھی سی چائے کا بھی انتظام کرو۔“

”جی بہتر.....!“ وہ جانے لگی تو راجہ کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔

”سنو.....! اگر براندہ مانو تو میں ذرا علی کو دیکھ آؤں۔“ وہ کچن میں نائلہ سے بولی۔

”کہاں ہے علی.....؟“

”صبیحہ کے پاس ہے۔“

”بالکل جاؤ بلکہ اب تم صبیحہ کے پاس ہی رہنا۔“

”کیوں.....؟“

”بس ہے ایک بات.....!“

”کون سی بات.....؟“ نائلہ جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی لیکن پھر پلٹ کر علی کو دیکھنے چل دی۔

علی صبیحہ کے پاس سو رہا تھا۔ اس نے پہلے صبیحہ کو مبارکباد دی پھر علی کے بارے میں پوچھنے لگی کہ تنگ تو نہیں کر رہا۔

”میرا خیال ہے اسے بھوک لگی ہے جو یہ بار بار اپنا انگوٹھا منہ میں لے رہا ہے۔“ صبیحہ نے کہا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”میرے خدا.....! اسے فیڈ رو دینا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اور فیڈر بھی وہیں کوارٹر میں رکھی ہے۔“

”اب تو سو رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں سوتے میں بی لے گا۔ ٹھہرو، پہلے میں اس کی فیڈر لے آؤں۔“

وہ جلدی سے نکلی اور تقریباً بھاگتی ہوئی درمیانی راستہ طے کر کے کوارٹر میں آئی۔ فیڈر کے ساتھ علی کی کچھ ضروری چیزیں بھی اس نے باسکٹ میں رکھیں اور جیسے ہی کمرے سے نکلنے لگی، ٹھنک کر رک گئی۔

بیرونی دروازے سے آصف جہاگیر داخل ہو رہے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ فوراً پلٹ کر دوبارہ کمرے کے اندر آ گئی۔

”میرے پاس دستک دینے کے لیے وقت نہیں ہے، اس لیے میں براہ راست اندر چلا آیا۔“ کچھ دیر بعد وہ اسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے وہ پلٹی تھی۔

”وہ میں..... فیڈر..... علی کی.....“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ رُک رُک کر بس یہی لفظ کہہ سکی۔

”میں جانتا ہوں، آپ یہاں کسی کام سے ہی آئی ہوں گی اور میں بھی اپنی ایک بات کا جواب لینے آیا ہوں۔“ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگے۔

”یاد ہے..... میں نے آپ کے ہاتھ بے جی کو ایک پیغام بھجوایا تھا کہ جس دروازے پر میں آپ کو چھوڑ رہا ہوں کسی دن اسی دروازے سے لینے بھی آؤں گا۔“

”آصف پلیز.....!“ اس نے رخ موڑ لیا۔ اور وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

”اپنی ذات سے نظریں چرا تا حماقت ہے راجہ۔ یہ بات آپ سمجھتی نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتیں؟“ اسے کچھ خوفزدہ سے انداز میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے۔

”سب سے پہلے تو اپنے دل سے یہ خوف نکال دیجئے کہ سب لوگ کیا کہیں گے۔ کیونکہ میں سب کی اجازت سے ہی یہاں تک آیا ہوں، البتہ بے جی۔“

”کیا.....؟“ وہ ان کی پوری بات سننے بغیر متوجہ ہی ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی اور وہ بے جی کا ذکر گول کرتے ہوئے بولے۔

”ہاں.....! اور سب کا خیال ہے کہ یہ پہاڑی زندگی بغیر کسی ساتھی کے نہیں گزاری جا سکتی۔“

”میں سب کے خیال کی نفی نہیں کروں گی، لیکن آپ سب یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں ایک ہی نہیں ہوں۔ علی میرے ساتھ ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں، لیکن کیا خود آپ کو علی کا خیال نہیں ہے۔ ابھی وہ چھوٹا ہے اور زیادہ وقت نہیں گزرے گا، جب وہ آپ سے سوال کرنے لگے گا۔ کب تک اور کہاں تک مطمئن کریں گی اسے، اور اگر اس کے علاوہ کوئی خدشہ ہے تو میرا یقین کریں رابعہ کہ آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے کبھی علی کو نظر انداز نہیں کیا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”میرا نظریہ اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ دل میں ایک بچے کے لیے گنجائش پیدا نہ ہو، اگر مزید آزمائش مطلوب ہو تو یہ یقین دلا دوں کہ میں صرف علی کا باپ بنوں گا۔ اس کے بعد کسی کا نہیں۔“

”میرے خدا.....!“ وہ منجھدی ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جو ان کے لہجے کی صداقتوں کی امین تھی اور وہ کہنے لگے۔

”ابھی کچھ عرصہ پہلے آپ نے کہا تھا کہ زندگی میں ہونے والے حادثات کو وقت کی گرد و حند لازمہ ضرور دیتی ہے، لیکن ان کے جو نشان دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ وہ مٹائے نہیں مٹتے تو اس بارے میں بھی میں آپ کو یقین دلا دوں کہ آپ کے دل پر نقش نشان خواہ وہ کسی حادثے کے ہوں یا کسی کی محبتوں کے۔ میں انہیں مٹانے کی کوشش نہیں کروں گا اور نہ ہی مٹا دینے پر اصرار۔ ہاں یہ یقین ضرور ہے کہ جس طرح حادثات کو وقت کی گرد نے دھندلایا ہے اسی طرح میری محبتیں ان نشانوں کو دھندلا دیں گی۔“ اس کے خاموشی سے سر جھکانے پر کہنے لگے۔

”لیکن ایک بات یاد رہے رابعہ.....! کہ آپ کا دل میرے نام پر دھڑکنے لگے تو پوری ایمانداری سے اعتراف کیجئے گا۔“

اس کی پیشانی کو اپنی شہادت کی انگلی سے چھو کر اس کا سر ڈرا سا اونچا کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”اوں ہوں.....! رونا نہیں ہے۔ گزشتہ ماہ و سال میں جو موتی لٹا چکی ہیں، انہیں ہی بہت

بکھلیں اور اب صرف ہونٹوں کی کلیاں چٹکنے دیں۔“ بالکل غیر ارادی طور پر وہ پلکیں جھپک جھپک کر ماری گی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”مگر.....!“ وہ ہلکے سے مسکرائے اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

”جب میں یہاں آ رہا تھا تو سب نے میری کامیابی کی دعا کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنی میں آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو۔ سب کا کہنا تھا کہ بقیہ زندگی بنا ساتھی کے کتنی ناخوش ترین ہوگی۔“ اس حقیقت سے وہ خود بھی انکار نہیں کر سکتی تھی اور اب جب کہ سامنے کھڑا شخص نہ صرف اسے بلکہ اس کے بچے کو بھی پورے خلوص سے سانسبانی مہیا کر رہا تھا تو اسے نظریں نہیں ہرائی جاسکتیں۔ ہو سکتا ہے کل جب وہ خود ساتھی کی ضرورت محسوس کرے تو ایسا قفل اور محبت کرنے والا کہیں نہ ملے۔

”رابعہ.....!“ محبتوں سے چور لہجے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نے بہت آہستگی سے اپنا نازک سا ہاتھ ان کے مضبوط ہاتھ پر رکھ دیا جسے فوراً ہی انہوں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اسی طرح ان کے ساتھ چلتی ہوئی وہ اندر آئی۔ ہال کمرے کا ماحول خاصا خوشگوار تھا۔ چائے کے دوران سب بہت اچھے موڈ میں باتیں کر رہے تھے ان دونوں کو ساتھ داخل ہوتے ہوئے سب نے دیکھا۔ اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کو ڈرا سا اونچا کر کے سامنے نظر ڈالی۔ تاہم مسکراتے ہوئے سر ہلارہی تھی۔ اس نے جھینپ کر نظروں کا زاویہ بدلا اور کھلتے چہروں پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں بے جی پر ٹھہریں تو لہجہ بھر کو اس کے پورے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ان کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔

”رابعہ.....!“ میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ پتا نہیں بے جی کا لہجہ واقعی چبھتا ہوا تھا یا اسے محسوس ہوا تھا۔ اس کے سینے میں سانس رکنے لگی اور بے جی کی طرف قدم بڑھایا تو لہجہ بہ لہجہ ڈاکٹر آصف جہا نگیر سے دور ہوتی چلی گئی گو کہ اپنی پشت پر ان کی حوصلہ دیتی نظروں کی چشم صاف محسوس کر رہی تھی، پھر بھی دل میں کچھ اندیشوں اور کچھ خوف نے گھر کر ہی لیا تھا۔ بے جی کے پاس بیٹھی تو یاد آیا کہ ڈاکٹر آصف، بے جی کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے اس نے سوچا، اگر وہ وہیں جان لیتی تو اس طرح ان کے ساتھ چلتی ہوئی سب کے درمیان میں نہ آتی۔ بے جی نے بات کرتے ہوئے یونہی اپنا ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیا تھا۔ وہ چونکی اور پھر ذہن سے ہر خیال جھٹکتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی کہ یہاں کس موضوع پر بات ہو رہی ہے۔

آئی اور انکل رجن، بے جی اور بابا پر زور دے رہے تھے کہ اسی ہفتے فراز اور صبیحہ کا نکاح دیا جائے۔

”ارے.....! یہاں بات پکی ہو کر نکاح تک آپہنچی ہے اور مجھے خبر ہی نہیں۔“ اس نے سوچا اور پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

”ابھی صرف نکاح ہی کر دیں، رخصتی جب آپ کہیں گی، تب کر لیں گے۔“ آنٹی کی بات پر بے جی کہنے لگیں۔

”اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا.....؟“

”بات فائدے نقصان کی نہیں ہے بیگم صاحبہ.....!“ انکل رجن کہنے لگے۔

”ایک مدت سے ہمارے گھر میں کوئی خوشگوار ہنگامہ نہیں جاگا، بس اسی بہانے ہم اپنے گھر میں رونقیں دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر جب بات پکی ہو گئی ہے تو ہماری خواہش بھی پوری کر دیجئے۔“

”مان لیجیے بے جی.....!“ وہ بے اختیار بے جی کا ہاتھ تھام کر لجا جت سے بولی۔

”انکل اور آنٹی اتنا اصرار کر رہے ہیں اور پھر مجھے بھی مدتوں بعد بھائی ملا ہے تو.....؟“

”چلو بھئی.....! رابعہ کہہ رہی ہے تو ہمیں منظور ہے۔“ بابا نے فوراً فیصلہ سنایا تو وہ ایک دم خوش ہو گئی پھر دن اور تاریخ طے کرنے کے بعد سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بے جی اور بابا نے سب کو وہیں سے رخصت کیا جب کہ وہ احتشام بھائی اور صائمہ بھائی کے ساتھ باہر تک آئی۔

”فراز.....!“ سب روش پر آگے تک چلے گئے تو وہ فراز کا ہاتھ پکڑ کر وہیں رکتے ہوئے بولی۔

”صبح سب سے پہلے ابا اور اماں کو جا کر بتانا۔ انہیں تمہاری خوشی میں شریک ہونا ہے۔“

”بالکل.....! ان کے بغیر تو کوئی کام نہیں ہوگا۔“ فراز نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

”اور سنو.....! کل میں تمہیں لینے آؤں گا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”دیکھو ناں.....! کل پانچ دن ہیں اور یہ دن تم ہمارے ساتھ رہنا، کیا تمہاری خواہش نہیں ہے کہ تم تیاری میں آنٹی کا ہاتھ بناؤ۔“

”ہاں.....! کیوں نہیں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہر بات اور ہر چیز میں تمہاری پسند شامل ہو۔“

”میں بے جی سے بات کروں گی۔“ وہ پر سوچ انداز میں بولی۔

”کیا بے جی منع کریں گی.....؟“

”انہیں منع تو نہیں کرنا چاہئے، ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔ میں کچھ وقت تمہارے ساتھ

رہنا چاہتا ہوں اور اس سے اچھا موقع اور کون سا ہوگا بھلا.....؟“

”ہاں.....! اور ایسے موقع بار بار بھی نہیں آتے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”خیر.....! تم فکر مت کرو، بے جی منع نہیں کریں گی۔“ پھر اس کے ساتھ چلتی ہوئی سب

کے ساتھ آئی۔

”او کے..... رابعہ.....!“

بالکل اس کے گلے لگی پھر عاطف اور ڈاکٹر آصف کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھی اور فراز انکل

رجن اور آنٹی کے ساتھ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے کچھ دور تک انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر احتشام بھائی اور صائمہ بھائی کے ساتھ

اندر آ گئی۔ پہلے وہ ہال کمرے میں آئی۔

”چائے کے برتن اسی طرح رکھے تھے اور دیر ہو جانے کی وجہ سے ملازم بھی شاید چلا گیا تھا۔

اس نے خود ہی برتن سینے شروع کر دیئے۔

جب وہ برتن اٹھا کر کچن کی طرف جا رہی تھی تو بے جی کے کمرے سے ان کی اور بابا کی آواز

اسے باہر تک سنائی دی۔ گو کہ وہ بہت اونچی آواز میں نہیں بول رہے تھے، لیکن خاموشی اور رات

ہونے کی وجہ سے آوازیں کچھ گونجتی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ اس کا ادھر متوجہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں

تھا، لیکن اپنا نام سن کر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں رک گئی۔

”آج رابعہ کو کچھ کر مجھے خوشی ہوئی۔“ بے جی کہہ رہی تھیں۔

”اور مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ اتنا عرصہ اسے زندگی سے دور رکھ کر

میں نے اچھا نہیں کیا۔ بہر حال اب وہ اس گھر میں اسی طرح رہے گی، جیسے ہم سب رہتے ہیں لیکن

حیات.....!“ بے جی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

”یہاں تک تو سب ٹھیک ہے، لیکن اس سے آگے آپ لوگ جو کچھ اس کے لیے سوچ رہے

ہیں، وہ میرے لیے دکھ اور تکلیف کا باعث ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ بابا پوچھنے لگے۔

”آپ لوگ اسے ڈاکٹر آصف کے ساتھ منسوب کرنے کا سوچ رہے ہیں ناں تو یہ کسی

طرح ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے، کیا آپ کو ڈاکٹر آصف پسند نہیں.....؟“

”ڈاکٹر آصف ہو یا کوئی اور، اس لحاظ سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں ہوگا۔ وہ میری بہو ہے خضر.....! میرے پوتے کی ماں۔“

”صالحہ.....!“ خضر حیات شاید انہیں شام کے لحوں کی باتیں یاد دلانا چاہتے تھے، انہوں نے ٹوک دیا۔

”بس خضر.....!“ اس بات کو یہیں ختم کر دیں، میں حسام کی جگہ کسی اور کو نہیں دیکھ سکتی اور یہ بات آپ راجہ کو بھی سمجھا دیجئے گا۔“

”وہ بابا کا جواب سننا چاہتی تھی، لیکن ان کی خاموشی طویل ہو گئی تھی اور وہ ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے تھک گئی تو بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

اسے بے جی کی باتوں نے دکھ نہیں پہنچایا تھا، لیکن پھر بھی کوئی بات تھی، جس نے اسے بے چین کر دیا۔ اپنی کیفیت کو وہ خود نہیں سمجھ سکی۔ کوئی خیال نہیں کوئی سوچ نہیں پھر بھی بے چینی اس قدر کہ دو تین بار چولہا جلایا اور بجھا دیا۔ کیبنٹ کھولے اور بند کیے۔

”کیا کھو گیا ہے.....؟“ دل کی سرگوشی میں راز داری تھی۔

”پتا نہیں.....“ بے بسی سے سر جھٹکا اور اندر چلی آئی۔ علی اور اس کے ساتھ صبیحہ بے خبر ہو رہے تھے۔ وہ علی کو اٹھانے کے بجائے وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے ساتھ ہونے والی اچانک تبدیلی کو سوچتی رہی پھر نیند آ گئی۔

اگلے دن جب فرازا اسے لینے آیا، اس وقت تک اس نے بے جی سے بات نہیں کی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے یاد نہیں تھا۔ یاد تو تھا، لیکن اس نے سوچا، پتا نہیں بے جی انکل رحمن کے گھر رہنے کی اجازت دیں گے یا نہیں، لیکن بے جی نے بخوشی اجازت دے دی۔

”اس خوشی پر سب سے زیادہ تمہارا حق ہے بیٹی! میں تمہیں نہیں روکوں گی۔“

اور جب وہ آ رہی تھی تو بے جی اس سے کہنے لگیں۔

”رحمن صاحب کے گھر اور لوگوں کا آنا جانا بھی رہے گا، بس تم ذرا محتاط رہنا۔“

اس نے یونہی سر ہلادیا تھا، لیکن جب انکل رحمن کے گھر اس نے ڈاکٹر آصف کو دیکھا تب وہ کبھی کہ یقیناً بے جی کا اشارہ انہی کی طرف تھا۔

”میں بے جی کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔“ اس نے سوچا۔

”اگر وہ ایسا نہیں چاہتیں تو میں بھی ایسی کسی سوچ کو دل میں جگہ نہیں دوں گی۔“

انکل رحمن اور آئی نے اس کی آمد پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ آئی نے یہاں تک کہا کہ آج

مجھے اپنا گھر کھل نظر آ رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میری بیٹی کہیں دور سے اپنے بھائی کی شادی میں شریک ہونے آئی ہو۔

انکل رحمن ڈاکٹر آصف کے ساتھ پروگرام طے کر رہے تھے۔ فراز بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور وہ علی کو اٹھا کر آئی کے ساتھ ان کے کمرے میں آ گئی۔ پھر اس وقت تک وہ وہاں سے نہیں نکلی جب تک اسے ڈاکٹر آصف کے جانے کا یقین نہیں ہو گیا، لیکن وہ کب تک ان سے دامن بچاتی۔

یہ ان کے چچا کا گھر تھا اور ایسا موقع تھا کہ وہ صبح شام یہاں آ رہے تھے اور کیونکہ انکل رحمن زیادہ انہی پر بھروسہ کیا ہوئے تھے، اس لیے رات دیر تک وہ یہیں موجود رہتے۔ پہلے دو دن تو ان سے سامنا ہوا بھی تو وہ کترا کر نکل گئی، لیکن تیسرے دن وہ راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

”یہ گریز کیوں.....؟“ وہ پوچھ رہے تھے اور اس کے پاس جواب نہیں تھا، اس لیے راہ فرار ڈھونڈنے لگی۔

”اس روز کی میری تمام باتوں کو شاید آپ نے کسی دیوانے کی.....“

”نہیں ڈاکٹر آصف.....!“ وہ فوراً بول پڑی۔

”پھر اس بے نیازی کو میں کیا سمجھوں.....؟“

”سمجھنا ضروری ہے کیا.....؟“

”کوئی نام تو ہو۔“

”بے نام ہی رہنے دیں۔“ وہ جانے کو تھی کہ اس کا ارادہ بھانپ کر انہوں نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ڈاکٹر آصف.....! پلیز..... سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”آپ سمجھائیں گی، تب سمجھوں گا نا۔“ وہ اس کے اچھنے پر محظوظ ہو کر بولے۔

”انکل یا آئی میں سے کوئی آ گیا تو پتا نہیں کیا سمجھیں۔“

”سب سمجھتے ہیں، بس ایک آپ نہیں سمجھ رہیں۔“

”میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتی پلیز.....!“ وہ رو دینے کو ہو گئی تو چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

”راجہ.....!“ وہ پہلے حیران ہوئے پھر پریشان اور پھر بڑھ کر اس کی کلائیاں تھامتے ہوئے ہاتھوں کو چہرے سے ہٹا دیا۔ وہ رو رہی تھی۔

”کیا بات ہے.....؟“ وہ نرمی سے پوچھنے لگے۔

”کیا میری ذات آپ کے لیے کسی پریشانی کا سبب بنی ہے.....؟“

”نہیں.....!“

”پھر.....؟“

”بس آپ میرے لیے سوچنا چھوڑ دیں۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔“

”آپ بے جی سے ڈرتی ہیں۔“ وہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

”میں ان کا احترام کرتی ہوں اور ان کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی۔ ان کی سوچ غلط نہیں ہے۔“

اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو میرے احساسات بھی ایسے ہوتے۔“

”مجھے بتائیں..... بے جی نے آپ سے کیا کہا.....؟“

”بجدا انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔“

”پھر.....؟“

”وہ بابا سے باتیں کر رہی تھیں، بس اتفاق سے میں نے سن لیں۔“

پھر ان کے اصرار پر اس نے ساری باتیں کہہ سنائیں، آخر میں کہنے لگی۔

”ذاکر آصف.....! بے جی نے مجھے اس گھر میں دوبارہ وہی مقام دے دیا ہے، اب اور

کچھ نہیں چاہیے مجھے۔“

”دوبارہ وہی مقام.....؟“ انہوں نے تلخی سے کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل

گئے۔

پھر وہ مزید دو دن وہاں رہی۔ اس دوران کئی بار ان سے سامنا ہوا، لیکن انہوں نے پھر اس

سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن جن نظروں سے دیکھتے تھے، اس سے اس کے اندر آزدگی

سننے لگتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس خوشی کے موقع پر اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ وہ

ڈھنگ سے خوشی کو محسوس ہی نہیں کر رہی۔

بالآخر وہ گھڑی بھی آگئی، جس کا ہر بہن شدت سے انتظار کرتی ہے۔ فراز دولہا کے روپ

میں سامنے آیا تو وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”بھائی.....! اللہ تمہیں ہر بد نظر سے محفوظ رکھے۔“ وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی بڑی خوشی بھی نصیب ہوگی۔“

”بے وقوف.....! تمہارے نصیب میں تو ابھی ڈھیروں خوشیاں ہیں۔“ فراز اسے اپنے

ساتھ لگائے ہوئے باہر نکل آیا اور گاڑی میں بھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ دوسری طرف آنٹی تھیں اور

انگل رتن نے ابا کو اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔

جس وقت وہ گاڑی سے اتر کر فراز کا بازو تھامے ہوئے انصر کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

سب سے پہلے نائلہ اور عاطف سے سامنا ہوا۔

وہ دونوں مہمانوں کے استقبال کے لیے گیٹ کے پاس ہی موجود تھے۔

”بس رابعہ.....! اب تم اس گھر کے فرد کی حیثیت سے یہاں میرے پاس آ جاؤ۔“ نائلہ

نے کہا تو وہ ایک ادا سے بولی۔

”نہیں بھئی.....! اس وقت میں صرف دولہا کی بہن ہوں۔“

اور فراز کے ساتھ ہی اندر چلی گئی۔ پھر سب مراحل بخوبی طے ہو گئے۔ نکاح اپنے وقت پر

ہوا۔ اس کے بعد کھانا اور پھر ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہونے لگے تھے۔

علی کو شاید نیند آ رہی تھی، اس لیے وہ رونے لگا تھا۔ وہ اسے لے کر صبح کے کمرے میں آ

گئی۔ خیال تھا اسے صبح کے پاس چھوڑ کر خود آ جائے گی، لیکن علی، صبح کے پاس جانے کو تیار ہی

نہیں ہوا۔ مجبوراً وہ خود اس کے ساتھ لیٹ گئی اور جب اسے سنانے کے بعد باہر آئی تو تقریباً سب

مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ بس انگل رتن کی فیملی اور اس کے اپنے گھر والے ہی یعنی اماں ابا تھے

اور وہ بھی جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

”علی سونے کے لیے جگ کر رہا تھا، میں اسے سنانے چلی گئی تھی۔“ وہ کسی کے کچھ پوچھنے

سے پہلے ہی اپنی غیر موجودگی کی وجہ بتانے لگی۔

”آؤں گی ابا.....!“ اس نے کہا پھر اماں اور بہنوں سے ملی۔

پھر صرف نائلہ رک گئی تھی باقی سب چلے گئے۔ اس نے اور نائلہ نے مل کر کچھ پھیلا ہوا

سامان سمیٹا پھر بے جی کے نوکنے پر کہ صبح سب ہو جائے گا۔ وہ نائلہ کو لے کر اپنے کمرے میں آ

گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے علی کے برابر لیٹی تو تنگن کا احساس ہونے لگا۔ دل چاہا چپ چاپ

آنکھیں بند کر کے سو جائے، لیکن نائلہ شاید ابھی سونے کے موڈ میں نہیں تھی۔

لباس تبدیل کر کے اطمینان سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی

تھی۔

”بس نائلہ.....! اب سو جاؤ۔“ اسے ابھینے ہوئے لگی۔

”اتنی جلدی.....!“ نائلہ برش رکھ کر اس کی طرف پلٹی۔

”بارہ بج رہے ہیں اور تم جلدی کہہ رہی ہو۔“

”صرف بارہ ہی تو بجے ہیں اور ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“ نائلہ بیٹھنے

ہوئے بولی تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں کون سی باتیں کرنا ہیں۔ اس لیے ان باتوں کو دہرا کر خواہ مخواہ اپنا وقت اور انرجی مت ضائع کرو۔“

”ٹھیک ہے، میں کوئی بات نہیں دہراتی، لیکن تمہارا جواب ضرور سنوں گی۔“

”کس بات کا جواب.....؟“ وہ ایک دم آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہائیں..... ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں معلوم ہے، میں کیا بات کرنا چاہ رہی ہوں.....؟“ نائلہ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں.....! معلوم ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ تم کس بات کا جواب سننا چاہتی ہو.....؟“ اور نائلہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ فون کی بیل نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ رات کے سنائے میں گھنٹی کی آواز دور تک سنائی دی تھی۔

”اس وقت کس کا فون ہوگا.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”میرا خیال ہے، عاطف ہوں گے۔“ نائلہ اٹھتے ہوئے بولی، پھر جلدی میں کمرے سے نکل گئی اور وہ جو سونا چاہتی تھی، اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی، لیکن چند لمحوں بعد ہی نائلہ کی چیخ ہوئی پکار آئی۔

”بابا.....! بے جی.....!“

”الٹی خیر.....!“ وہ فوراً اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

”بابا، بے جی اور احتشام بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل رہے تھے۔ نائلہ بہت عجلت میں بتا رہی تھی۔

”ہاں نہیں بابا، فراز کو کیا ہوا ہے، اسے آصف بھائی اپنے کلینک لے گئے ہیں۔“

”فراز.....!“ وہ چیخی۔ ”کیا ہوا ہے میرے بھائی کو؟“

”آرام سے بیٹا.....! آرام سے۔“ بابا نے بڑھ کر اسے قہقہہ لایا۔

”مجھے بتائیں فراز کو کیا ہوا ہے، مجھے اس کے پاس لے چلیں۔“ وہ اپنے حواس کھونے لگی تھی۔ بس ایک خیال، کہیں وقت کا ظالم بچہ.....!“

”نہیں.....“ وہ ہندیانی انداز سے چیخی۔ ”اللہ میاں جی.....! میری برداشت سے بڑھ کر میری آزمائش مت کر، میں مر جاؤں گی۔“

”رابعہ.....!“ اس طرح مت روؤ، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”احتشام بھائی نے جا کر گاڑی نکالی اور وہ سب جس طرح کھڑے تھے چل پڑے۔

اس کا دل سہم گیا تھا اور تمام راستہ گزرے ماہ و سال کا ہر وہ پل جب وہ خوش ہوتی تو اچانک

ی کہیں سے وقت کا ظالم پنجہ اس کے سر پر آن کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں آسمان۔

”کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا.....؟“ اس کے آنسو تو اتر سے بہنے لگے۔

”نہیں..... اللہ میاں.....! اگر فراز کو کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔“

ڈاکٹر آصف کے کلینک میں انکل رحمن، آنٹی اور عاطف موجود تھے۔ ایک تو رات کا وقت

تھا، دوسرے کلینک کا مخصوص خاموش اور پراسرار سا ماحول جس نے دل دہلا کر رکھ دیا۔

”کہاں ہے فراز.....؟“ وہ آنٹی کے کندھے قہقہہ کر کے صبر سے پوچھنے لگی۔

”جواب میں انہوں نے ایمر جنسی کی طرف اشارہ کیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ ٹھیک تھا۔ پھر اچانک کیا ہوا ہے.....؟“

”رابعہ.....! تم پلیز یہاں بیٹھو۔“ نائلہ نے اسے بٹھا دیا تو وہ خالی خالی نظروں سے ایک

ایک کی طرف دیکھنے لگی۔

انکل رحمن، بابا اور بے جی کو شاید فراز کے بارے میں بتا رہے تھے، آواز اس تک نہیں پہنچی

رہی تھی، اس لیے وہ بغور انکل رحمن کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگی، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ

نہیں آیا۔

وہ اٹھنے کو تھی کہ کندھے پر دباؤ محسوس کر کے ادھر دیکھنے لگی۔ آنٹی اس کے پاس بیٹھیں پھر

ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”یہ فراز نے تمہارے لیے دیا ہے۔“

”کب.....؟“

”جب ہم انکسٹر سے لوٹے تو فراز نے یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ صبح رابعہ آئے گی، اسے دے

دیجئے گا۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی ان کی طرف اور کبھی لفافے کی طرف دیکھنے لگی۔

”کھولو اسے۔“ نائلہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ چونکی پھر لفافہ کھول کر اس میں سے

کاغذ نکال لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نائلہ نے بھی فراز کی تحریر میں نظریں جمادیں۔

”رابعہ.....! مجھے معاف کر دینا میری بہن کہ میں تمہارے لیے کچھ نہ کر

سکا۔ پہلے تمہیں اور امی کو بے آسرا چھوڑنے کا سزاوار ہوا گو کہ اس وقت میں بہت

بڑا نہیں تھا پھر بھی امی سے بیٹے اور تم سے بھائی کا مان تو چھیننا ہی، اور جب قدرت

نے دوبارہ ہم دونوں کو ملایا تو میں نے سوچا تھا گزرے ماہ و سال کی تلافی کروں گا،

لیکن میں شاید حالات کو شکست نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں ڈھیر ساری خوشیاں دینا

چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں تمہیں اس زندگی سے نکال لاتا جو بے جی

نے تمہارا مقدر کر دی ہے۔ اس کے لیے بظاہر آسان سارا راستہ تو یہ تھا کہ میں کسی دن آکر کہتا۔ اب میں آ گیا ہوں رابعہ میرے ساتھ جائے گی اور پھر ہم دونوں مکمل الگ اپنی دنیا بسالیتے، لیکن ایک طرف تو میں احسانوں کے بوجھ تلے دبا تھا، دوسری طرف تم بھی بے جی کا گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ بہر حال رضا کی برتھ ڈے میں تمہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے سوچا تھا یہاں سے ہمارا راستہ آسان ہو جائے گا، لیکن اسی شب میری اور صبیحہ کی بات طے ہونے کے بعد جب تمہارا اور آصف بھائی کا ذکر آیا تو بے جی نے سختی سے اس موضوع کو ختم کر دینے کے لیے کہا۔ ان کا کہنا تھا تم حسام کی بیوی تھیں اور اب ہمیشہ اس کی بیوہ رہو گی۔ اس بات نے مجھے تکلیف پہنچائی اور میرا دل چاہا میں اسی وقت تمہیں وہاں سے نکال لے جاؤں، لیکن میں جانتا تھا تم اپنی محبتوں کا واسطہ دے کر مجھے روک لو گی اور تمہارے سامنے تو میں بے بس ہو جاتا ہوں، تمہاری کوئی بات رد کرنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں اور پھر اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بے جی کے دل پر ہاتھ رکھ دوں گا۔ اب تک وہ صرف ساس بن کر سوچتی آئی ہیں، جب ماں بن کر سوچیں گی تو شاید ان کے رویوں میں چلک پیدا ہو جائے۔

میں تمہاری خاطر رابعہ.....! تم سے دور جا رہا ہوں صرف تمہاری خاطر اپنی زندگی کا خاتمہ کرتے ہوئے صبیحہ کے سر پر بیوگی کی چادر اوڑھا رہا ہوں بے جی سے کہنا اگر منصف ہیں تو صبیحہ کے لیے بھی وہی راستہ منتخب کریں جو تمہارے لیے کیا تھا، ورنہ دوسری صورت میں تمہیں اپنے ہاتھوں ڈاکٹر آصف جہانگیر کے ساتھ رخصت کریں کہ زندگی میں یہی میری خواہش تھی۔

تمہارا فراز.....!

”فراز.....!“ وہ پوری قوت سے چیخا چاہتی تھی۔ لیکن آواز ساتھ چھوڑ گئی۔ دیوانگی کے عالم میں اٹھ کر اسی طرف بھاگی، جہاں ڈاکٹر آصف جہانگیر، فراز کو زندگی کی طرف لانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ابھی کوریڈور میں ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر آصف باہر آتے نظر آئے۔

”ڈاکٹر آصف.....!“ وہ ان ہی کی طرف لپکی تھی کہ پکٹے فرش پر پاؤں پھسل گیا اور گرنے کو تھی کہ انہوں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

”فراز.....!“ ان کا سہارا غنیمت تھا، ورنہ وہ کسی طرح بھی خود سے کھڑے ہونے کے

تھیں نہیں تھی۔

”وہ ٹھیک ہے اور آپ ہی کو دیکھنا چاہ رہا ہے۔“ وہ ان کے بازو کا سہارا لیے ہوئے چل پڑی۔

فراز انکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ قریب پہنچی تو ڈاکٹر آصف کو چھوڑ کر اس کے سینے پر گر گئی۔

”تم مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے۔“ اس کے سینے میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فراز نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ جھٹکتے ہوئے اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اس کے آنسو کی طرح جھنسنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

اسی وقت باقی سب لوگ بھی اندر آ گئے۔

”رابعہ.....! یہ کیا کر رہی ہو.....؟“ نائلہ نے اسے اٹھانا چاہا۔

”مجھے میرے بھائی سے الگ مت کرو۔“ وہ نائلہ کے ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”تمہیں تمہارے بھائی سے کوئی جدا نہیں کرے گا۔ لیکن اس وقت اسے آرام کی ضرورت ہے۔“ بابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ڈاکٹر آصف خاموش نہ رہ سکے۔

”فراز سے زیادہ خود انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے میں انہیں نیند کا انجکشن لگا دیتا ہوں۔“

”نہیں.....“ وہ فوراً بولی۔ ”میں نہیں سوؤں گی۔ میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہی وقت کا غلام بنیجی.....“

”رابعہ.....!“ فراز نے ٹوک دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں اور پلیز تم اس طرح مت روؤ، مجھے ڈکھ ہوتا ہے۔“

”میرے رونے کا احساس ہوتا تو اس طرح کیوں کرتے.....؟“

”میرا خیال ہے رابعہ.....! بعد میں آپ اس کی اچھی خاصی خبر لیجیے گا۔ اس وقت اسے آرام کرنے دیں۔“

”آپ سب بھی خامے بے آرام ہو چکے اور اب ویسے بھی یہ ٹھیک ہے اور کچھ دیر میں سو بھی جائے گا، اس لیے.....“

ڈاکٹر آصف خاموش ہو گئے۔ ان کا خیال تھا، سب ان کا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔

”میں اس کے پاس ہی رکوں گی۔“ اس کے کہنے پر بے جی آگے بڑھ آئیں۔

”بیٹا.....! تم گھر جاؤ۔ میں ہوں اس کے پاس۔“ وہ فراز کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے سر

ہلا کرتا سیدی۔

”بس تو بے جی اور آئی نہیں رکیں گی، باقی سب چلتے ہیں۔“

”او کے فراز.....!“ سب باری باری فراز سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے..... وہ کھڑی ہوئی تو بے جی کہنے لگیں۔

”آصف.....! مجھے رابعہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

اس کے بڑھتے قدم ٹک گئے اور فوراً پلٹ کر بے جی کی طرف دیکھنے لگی تو انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

”ڈاکٹر آصف تمہیں گھر چھوڑ دیں گے اور پھر تمہیں ان کے ساتھ تو جانا ہی ہے۔“

وہ نظروں کا زاویہ بدل کر فراز کی طرف دیکھنے لگی۔ جو احساس طمانیت میں گھر کر آگئیں بند کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

”چلیے.....!“ عقب سے ڈاکٹر آصف کی آواز آئی تو وہ بے جی کا اشارہ پا کر دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے ساتھ چل پڑی۔

کورڈور کی حد ختم ہوتے ہی انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بری طرح نرم ہو گئی۔ ان کا ہاتھ ہٹانا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس کا ہاتھ بھی گرفت میں لے لیا۔

”بہت شوق ہے تمہا چلنے کا.....“ وہ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی، ویسے بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”سنو.....!“ وہ قدم روک کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ”اب یہاں سے آگے اسی وقت جائیں گے جب تم باقی ماندہ حیات کے سفر کے لئے مجھے اپنی ہمراہی کا یقین بخشو گی۔ فقط ایک مسکراہٹ سے.....“

”ڈاکٹر آصف.....!“

”اوں ہوں.....! فقط ایک مسکراہٹ.....“ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ان کی طرف دیکھنے پر آمادہ کیا۔ وہ بڑی دلکش مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر رنگوں کی برسات اترنے لگی۔ جنہیں اس نے خود بھی محسوس کیا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ برسات ہو اور کلیاں نہ چٹکیں رنگوں کی، محبتوں اور چاہتوں کی برسات نے اس کے دل کی خجڑ زمین کو سیراب کرنا شروع کیا تو دھم سی مسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر اتر آئی۔

”گنڈ.....!“ ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑے۔ بہت زیادہ دن نہیں گزرے تھے، جب دور تک پھیلے آسمان کے سینے پر جبکہ گاتے ستارے

اسے اپنا مذاق اڑانے لگے تھے۔ تم جھوٹی ہو اور اب جبکہ وہ ان کی سنگت میں کچھ قدم اٹھا رہی تھی تو وہی ستارے اسے اپنے راستوں میں بکھرے نظر آئے۔ ہر قدم جگمگاتے ہوئے اور اسے مہارک باد دیتے ہوئے جیسے آسمان سے ٹوٹ ٹوٹ کر چلے آ رہے تھے اور اب تو اسے مسکراتا ہی تھا۔ کیونکہ اپنی خاموشیوں، صبر اور ثابت قدمی کے جوچ اس نے پائے تھے۔ ان کی فصل گلوں کی صورت تیار تھی۔ تھوڑا انتظار تو کرنا پڑا، لیکن اب وہ آصف جہاں گیار کے سنگ ہی اسے کانٹے چار رہی تھی جو اس نے بویا تھا۔

○○○